اسلام ماست و چراغ ہر دو جہان
[illegible] زندہ دین من [illegible]

[illegible]

بعونہٖ تعالےٰ

اُسوۂ حسنہ

الموسوم بہ

زندہ اور کامل نبی صلی اللہ علیہ وسلم

مُصنّفہ

خواجہ کمال الدین صاحب بی۔ اے۔ ایل ایل بی

وکیل چیفکورٹ پنجاب

مُصنّف

صحیفۂ آصفیہ و کرشن اوتار

رفاہ عام سٹیم پریس لاہور میں منشی عبدالحق صاحب مالک و مینجر کے اہتمام سے چھپا

دفعہ اول　　　تعداد اشاعت پانچ ہزار

شکریہ

میں جب گذشتہ دسمبر کے آخری ایام میں ایک ضرورت پر پشاور گیا۔ تو فدائے قوم مکرمی مخدومی مفتی فدا محمد صاحب سلمہ بیرسٹر ایٹ لا پشاور کی خاص فرمائش اور اہلِ پشاور کی عام خواہش پر مجھے فرانٹیر محمڈن کلب میں متعدد لیکچر دینے کا اتفاق ہوا۔ یُوں تو جس اشتیاق اور جوش محبت کے ساتھ اہلِ پشاور نے میرے ہر ایک لیکچر کا خیر مقدم کیا وہ میری اُن دلچسپیوں کو از سرِ نو زندہ کرنے کے لئے کافی تھا جو مجھے احبابِ پشاور کے ساتھ تھیں۔ لیکن میرے آخری لیکچر نے ایک خاص الخاص تاثیر کے ساتھ شرفِ قبولیت حاصل کیا۔ اس آخری لیکچر کا موضوع تھا۔

"اِسلام کی علامات کیا ہیں اور کیا وہ ہم میں ہیں"

اس لیکچر کے دوران میں عام تو عام معزز طبقۂ سامعین میں بھی مجھے بہت تھوڑے ہی نظر آئے جو میری عرضداشت کو سُن کر چشم پُرنم نہ ہو رہے تھے۔ اُنھیں بزرگوں میں **نوشہرہ** کے رئیس اعظم عالیجناب خان بہادر میاں رحیم شاہ صاحب کاکاخیل سی۔ آئی۔ ای بھی تھے۔ جو اول دفعہ ہی اس میرے لیکچر میں آئے تھے خاتمہ لیکچر پر میاں صاحب نے نہایت دردناک لہجہ میں اس عاجز کیلئے دعائے خیر کی۔ اور بعد میں آپ کی مہمان نواز فیاض طبیعت نے مجھے ایک خاص طریق پر مرہُونِ احسان کرنا پسند کیا۔ آپ نے چھ اشرفی طلائی بطورِ ضیافت کے مجھے دینی چاہیں۔ مجھے اِن اشرفیوں کے لینے میں بالضرور تامل ہوتا۔ اگر ایک

خاص وجہ مجھے اُس وقت میاں صاحب کے اِس دوستانہ عنایت کے قبول کرنے پر مُحرّک نہ ہوتی +

میاں صاحب موصُوف اگرچہ قومی معاملات مین بھی خاص دلچسپی رکھتے ہیں جس کا ثبوت آپ کے وقتاً فوقتاً گرانبہا عطیوں سے ہؤا کرتا ہے لیکن یہ امر شاید بہت تھوڑے لوگوں کو معلوم ہو گا - کہ میاں صاحب اپنی کثیر آمدنی کا ایک خاص حصّہ ہر سال فراخ دلی سے خیرات میں صرف کیا کرتے ہیں - لیکن میاں صاحب کی یہ خیرات بھی ایک حد تک اُس اعتراض سے باہر نہیں - کہ جو عام طور پر ہم تمام مسلمانوں کی خیرات پر ہر جگہ عائد ہو رہا ہے - ہم مسلمان خدا کے فضل سے صاحبِ مال بھی ہیں اور صاحبِ خیرات بھی - لیکن ہم خیرات کا حقیقی مصرف نہیں جانتے - اگر ہم مسلمانوں کی خیرات کا ایک دسواں حصّہ بھی جائز ضروریاتِ قوم پر خرچ ہو جاوے تو بہت سی قومی بہبُودی اور اسلامی رفاہ کے کام نہایت آسانی سے سرانجام پالیں - مثلاً اشاعتِ اسلام کا ایک بھاری فرض قوم کے ذمہ ہے - اور قوم اُس کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہے - اس بات کی سخت ضرورت ہے - کہ قلم اور زبان کے ذریعہ اسلامی خوبیوں کو دنیا میں پھیلا یا جاوے - اور خصوصاً اُن حملوں کا جواب دیا جاوے جو مخالفینِ اسلام کی قلمیں اور زبانیں اسلام پر کر رہی ہیں - اسلام میں وہ خوبیاں ہیں جو سورج کی طرح کُل مذاہب دیگر کی آنکھیں چوندھیا سکتی ہیں - اور اسلام کی افضلیت دنیا میں چمکا سکتی ہیں - لیکن یہ باتیں علمی لیاقت کے علاوہ مالی امداد چاہتی ہیں - جس کے لئے کسی نئے چندہ کی ہرگز ہرگز کوئی ضرورت نہیں - اگر مسلمان اہلِ ثروت اپنی معمولی خیرات کا ایک حصّہ اس کام پر لگا دیں +

میں نے چاہا کہ ان چھ اشرفیوں کے ذریعہ جو میاں صاحب نے میری جسمانی ضیافت کیلئے

عطا فرمائیں ۔میں ایک مستقل روحانی دسترخوان اُن کے اور اُن کے ہموطنوں کے لئے
بچھاؤں اور مسلمان طلباء پشاور کو اُس پر صلائے عام دوں ۔ میرا تیسرا لیکچر
جو پشاور میں ہؤا ۔ وہ سید الکونین حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلوٰۃ اللہ علیہ
کے مقدّس سوانح اور آپؐ کے گرانمایہ اخلاق کی ایک نہایت ہی مختصر
تصویر تھی ۔ میں اُس لیکچر کو اس کتاب کی شکل میں میاں صاحب کے
پاس بھیجتا ہوں ۔ اور اُس کے ساتھ اس کی تین صد اَور کاپیاں
میاں صاحب کی طرف سے مفت تقسیم کرنے کے لئے بھی ہیڈ ماسٹر
صاحبان کی خدمت میں بھیجی جاتی ہیں ۔ میاں صاحب کی ضیافت سے
اگر میں متمتّع ہونا چاہتا تو وہ صرف ایک وقت کے لئے میرے اور میرے
دوستوں کے نفس کے واسطے باعث حظ ہوتی ۔ لیکن اب میاں صاحب
کی طرف سے مَیں نے وہ مہمانی طیار کی ہے ۔ کہ جس سے سالہائے دراز تک
ہزار در ہزار مخلوق خدا بہرہ اندوز ہوتی رہیگی +

کاش ہمارے مسلمان اُمرا اپنی خیرات کی ذرا اصلاح کریں ۔ اور
اُنھیں ایسے کاموں میں خرچ کریں ۔ مثلاً یہ کون نہیں جانتا ۔ کہ اس مغربی
روشنی کے زمانہ میں حضرت سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیاۃ
کے مقدس حالات کا جدید اصول پر لکھا جانا ازبس ضروری ہے ۔ اس
وقت تک اس ملک میں ایک بھی سوانح عمری آنحضرت صلعم کی ایسی نہیں
لکھی گئی جس میں مورخانہ تنقیدی اصول جدیدہ کی پیروی کی گئی ہو ۔ اور
میرا ایمان ہے ۔ کہ اگر خدا تعالیٰ ہمیں اس کتاب کے طیار کر دینے کی
توفیق دے تو لاکھ تبلیغ کی ایک تبلیغ وہ کتاب ہوگی +

میں نے ارادہ کیا ہے ۔ کہ میں آنحضرت صلعم کی مبسوط سوانح عمری

جدید اصول پر لکھوں - اور یہ کتاب یا یہ لیکچر جواب ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے - دراصل ایک دیباچہ اُس عظیم الشان کتاب کا ہے - جو میں کئی جلدوں میں لکھنا چاہتا ہوں - بحمد اللہ خدا تعالےٰ نے مجھے وہ طریق اور اصول سمجھائے ہیں - کہ جس سے وہ **محبُوب ربّانی** محبُوب زمانہ ہوسکتا ہے - خواہ اہل زمانہ کسی مذہب و ملّت سے تعلق رکھتے ہوں - **کتاب تو میں لکھ دونگا** - اور اپنے خرچ پر چھاپ کر اُس کی متعدّد کاپیاں بھی اشاعت میں لے آؤں گا - لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ میرے بھائی امداد میں شریک ہوں - اور اس کتاب کو اگر مفت نہیں تو نہایت ہی قلیل قیمت پر دنیا کی ہر سمت میں پہنچا دیا جاوے - آخر میں مَیں پھر میاں صاحب موصوف کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں +

احمدیہ بلڈنگس لاہور
۴ - جنوری سنہ ۱۹۱۲ء

خواجہ **کمال الدین** بی اے - ایل ایل بی وکیل
چیف کورٹ پنجاب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اللّٰھمّ صلّ علیٰ سیّدنا محمّدٍ وعلیٰ اٰلِ سیّدنا محمّدٍ واصحابِ سیّدنا محمّدٍ وبارک وسلّم

اُسوۂ حسنہ

یعنی

اِنسان کی عملی اور اخلاقی رہنمائی کے واسطے بہترین نمونہ

اے رب العٰلمین! تیری ہی حکمت بالغہ نے ضعیف البنیان انسان کو قوائے کی نشو ونما کے لئے محتاجِ نمونہ بنایا اور تیری ہی ربوبیّت نے اِنسان کی اُس فطری پیاس کو اُن مُقدّس نمونوں کے ذریعہ بُجھایا۔ کہ جنھیں دُنیا کی رہنمائی کے لئے تُو نے ہر مُلک وملّت میں اُٹھایا۔ تیرے ہی حکیم ہاتھ نے ہماری کشت فطرۃ میں گوناگون اخلاق کا

بیج ڈالا۔ اور **تُو** نے ہی اس کی آبیاری اُن مُستعد ہاتھوں سے کرائی۔ کہ جن کی پاک زندگیاں **تیرے** ہی **اخلاقِ کاملہ** کا مظہر بنیں + **تیرے** ہی **ایک چشمہ** ہدایت سے اے **ہادیٔ برحق**! کُل ہادیانِ مذاہب نے پانی پیا اور **تیرے** ہی ہاتھ نے اُن سب کو **ایک** صراطِ مُستقیم پر چلا کر اُن کے نقشِ قدم کو دوسروں کا خضرِ راہ بنایا۔ زمانہ نے آئے دن اگرچہ اُن پاک نقشوں کو دُھندلا کیا لیکن **تیری** رُبوبیّت کاملہ نے ہماری تربیّت کیلئے اور آنے والے مُقدّس قدموں کے ذریعہ اُن سابقہ نقوش کو پہلے سے بھی زیادہ روشن فرمایا۔ ہاں اقوامِ عالم نے اُس رازِ حقیقت کو نہ سمجھ کر سابقہ مخدُوش شدہ نقُوش پر قدم مارنے کیلئے اصرار کیا جس کا نتیجہ یہ ہُوا۔ کہ آج ہم سب کے سب مُسلم ہوں یا ہنُود عیسائی ہوں یا یہُود۔ اگرچہ **تیرے** ہی جلال کو دُنیا میں قائم کرنے کا اِدّعا رکھتے ہیں لیکن پھر اس ایک ہی نصبُ العین کے حصُول کے لئے ہم ایکدوسرے کو قطّاع الطریق نظر آرہے ہیں۔ اے دُنیا کے حقیقی **نُور**! دُنیا سے اب ظلمتِ جہالت کو دُور فرما اور اِس رازِ حقیقت کو دُنیا پر کھول۔ اے حیّ و قیّوم میں بصد عجز و اِلحاح **تیرے** حضور حاضر

التجا کرتا ہوں تو مجھے محض اپنے فضل و کرم سے توفیق عطا فرما کہ میں دنیا کی رہنمونی کے لئے تیرے اُس مظہرِ اتم کے مُقدّس قدموں کے زندہ نقوش دُنیا کے سامنے پیش کرسکوں۔ کہ جن کو دست بُردِ زمانہ آج تک مخدُوش اور دُھندلا نہیں کرسکی۔ اور جو پاک نقُوش اُنھیں مُطّہر انسانوں کے نقُوش کی اِس وقت یادگار ہیں کہ جنھوں نے وقتاً فوقتاً تجھ سے ہی راہِ ہدایت پاکر صراطِ مُستقیم پر قدم مارا اور اِس طرح مُختلف ممالک میں اپنی اپنی قوم کے ہادئی راہ بنے + اے دلوں کے مالک خُدا تُو ہم سے تنگ دِلی اور تنگ ظرفی دُور فرما۔ تُو ہمیں وسعتِ قلب عطا کر۔ تاکہ ہم تعصّب و ضدّیّت سے الگ ہوکر حقیقی نُور و ہدایت کو جہاں کہیں وہ ہمیں مل سکے اِختیار کریں۔ آمین آمین آمین

اما بعد اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخرۃ وذکر اللہ کثیراً۔ ترجمہ۔ تُم میں سے اُن کے لئے جو اللہ و یوم آخر پر اُمید رکھتے ہیں۔ اور خُدا کو ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔

رسُول خُدا کی ذات میں ایک بہترین نمونہ ہے ÷

ایک سطحی خیال آدمی کی نگاہ میں یہ چار اُمور جو اس آیت میں ذکر کئے گئے ہیں شاید بے ربط نظر آئیں۔ لیکن اگر انسانی سوسائٹی کی ساخت کو کسی قدر تعمّق کی نگاہ سے دیکھا جاوے تو یہی چاروں باتیں سوسائٹی کے قیام و فلاح کیلئے لازم و ملزُوم کی صُورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ اِنسانی تمدُّن و تہذیب کی تاریخ پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے یہ امر ایک اصُول مُتعارفہ کی طرح ثابت شدہ نظر آتا ہے۔ کہ اِنسان نیچر کی حالت چھوڑ کر تمدّن کے پہلے زینہ پر قدم رکھتے ہی قانُون کا محتاج ہو جاتا ہے۔ بقاو قیام کی جد و جہد سے تو اِنسان کیا ادنےٰ سے ادنےٰ حیوان بھی خالی نہیں۔ لیکن ذاتی حقُوق کا احساس اور اُن حقُوق کی حفاظت کا خیال اِنسانوں میں اُس وقت قوی ہو جایا کرتا ہے۔ جب اُن میں تمدّن کے آثار پیدا ہونے لگتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی سے ابتدائی تہذیب کی حالت میں بھی اِنسانی سوسائٹی نے اپنے لئے ایک ایسی شخصیت کی ضرورت کو عملاً تسلیم کیا ہے جو بقیہ افراد

سوسائٹی کے حقُوق کی تعیین وحفاظت کے لئے قواعد وضوابط مرتب کرے اُنھیں قواعد وضوابط کو سوسائٹی کی پولٹیکل شکل میں قانُون کہتے ہیں۔ اُن قواعد وضوابط کے واضعان نے مختلف وقتوں اور جگھوں میں کہیں پنچایت کہیں بادشاہ کہیں پارلیمنٹ اور کہیں لیجس لیٹو کونسل کی صُورت اختیار کی ہے۔ الغرض سوسائٹی کی ترقّی وتہذیب کے لئے ہر جگہ اور ہمیشہ ایک سرچشمۂ قانُون کی ضرورت تسلیم کی گئی ہے۔ جو دوسروں کے لئے قانُون مُرتّب کرے۔ لیکن یہ قوانین نتیجہ خیز نہیں ہو سکتے جب تک اُن کے نفاذ کے لئے ایک اور وجُود سوسائٹی میں پیدا نہ ہو جائے جو وضع کردہ قوانین کے ملحُوظ رکھنے والوں یا اُن کے توڑنیوالوں کے اعمال پر جزا اسزا مُرتّب کرے۔ اُس وجود کا نام **جج** یا **عدالت** ہوتا ہے۔ اور اس کا وجود بھی ہم ابتدا سے آج تک کسی نہ کسی صورت میں دیکھتے چلے آئے ہیں۔ اور یہی دو شخصیتیں یعنے **سرچشمۂ قوانین** اور **عدالت** حکومت یا گورنمنٹ کی ضروری اجزا اور رُوحِ رواں ہیں۔ ہاں

کوئی حکومت اپنی اغراض حقیقی کو پورا نہیں کر سکتی ۔ جب تک
افراد سوسائٹی کو حکُومت کی عملی طاقتوں پر ایمان نہ ہو ۔ رعایا کو
یہ علم و یقین ہونا چاہئیے کہ اس کے سر پر کوئی برائے نام حکُومت
نہیں بلکہ اُس گورنمنٹ میں قانُون کے بنانے والے اور ایسا ہی
قانُون کے مُجرموں کو سزا دینے والے بھی موجُود ہیں ۔ اِس غرض
کے پُورا کرنے کے لئے پولیس فوج اور مختلف قسم کے ماتحت عملے
ہر سلطنت میں تجویز کئے جاتے ہیں ۔ جن کی علّت غائی صرف استحضارِ
حکومت ہوتی ہے یعنے جس سے رعایا میں حکُومت کے وُجود کا احساس
پیدا ہو ۔ اور وہ گورنمنٹ کے وجُود کو عملی زندگی میں بُھول نہ جائیں
بلکہ آنکھوں پھر یاد رکھیں ۔ الغرض جُوں ہی انسان نے نیچر کی حالت
کو چھوڑ کر تمدّن کی طرف قدم اُٹھایا ۔ اس نے ان تین امور یعنی
سرچشمۂ قوانین ۔ عدالت اور یاد دہانی حکومت کو کسی نہ کسی
رنگ میں قائم کیا ۔ یہ تینوں اُمور جس قدر مضبُوط اور عمدہ صورت اختیار
کرتے ہیں ۔ اسی قدر ایک سوسائٹی تہذیب و فلاح میں ترقّی کرتی
ہے ۔ ہاں یہ بالکُل سچ ہے کہ اِنسانی حکُومت اور اُس کے قوانین

خواہ کیسے ہی مکمل سے مکمل کیوں نہ بنائے جائیں وہ ہمارے کُل اخلاق و افعال پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ بہت سا حصہ انسانی اخلاق و افعال کا اُن کے اثر و حکومت سے باہر رہ جاتا ہے۔ مثلاً دروغگوئی خواہ کیسا ہی ارذل اور قبیح امر سمجھا جاوے۔ لیکن اس کی ہر ایک نوع قانونی مواخذہ میں نہیں آسکتی۔ دروغ حلفی دغا اور جعل وغیرہ کے ماسوا کئی قسم کے جھوٹ اور فریب تعزیری سیاست سے باہر رہ جاتے ہیں۔ مرد عورت کے ناجائز تعلّق خاص حالات میں ہی قانون نے قابل سزا قرار دیئے ہیں۔ والّا ہر ایک سیہ کار بلا خطرۂ سزا ایک ایسی بالغ باکرہ یا بیوہ کی عصمت کو خاک میں ملا سکتا ہے۔ جسے وہ اپنی منشا کے موافق رضامند کر سکے۔ اور سب سے بڑھ کر ہمارے کُل حرکات و سکنات کا سرچشمہ ہمارا دل ہے۔ لیکن دُنیا کی زبردست سے زبردست گورنمنٹ بھی اس پر حکمران نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس نقص کو مذہب نے پُورا کیا۔ مذہب نے ایک علیم بذات الصّدور خدا منوا کر اُس خدا کو ہماری نیّات و قلب پر حکمران کرایا۔ ایسا ہی مذہب نے اُن اخلاقی نقائص کا مُواخذہ کیا کہ جو گورنمنٹ

کی حکومت سے باہر تھے۔ اور عجیب بات ہے کہ مذہب نے بھی
اپنی حکومت قائم کرنے کے لئے انھیں تین امور کی تعلیم دی جو
پولٹیکل سوسائٹی کی رُوح رواں ہیں۔ مذہب نے خُود خدا تعالےٰ
کی ذات کو سرچشمۂ قوانین قرار دے کر اُن قوانین کے توڑنیوالوں
کے اعمال کو ایک روز جزا کے زیرِ مُواخذہ کیا جسے مذہبی اصطلاح
میں **یوم آخر** کہا گیا ہے۔ پھر انسان میں خلاف ورزئ قوانین
الٰہیّہ کی استعداد کو زائل کرنے کیلئے اُنھیں **یاد خدا** کی تاکید کی +

الغرض پولٹیکل سوسائٹی نے اگر سرچشمۂ **قوانین** - **عدالت**
اور **یاد دہانی حکومت** کو اپنی مضبُوطی اور قیام کے لئے
ضروری سمجھا تو مذہب نے اُنھیں تین اُمور کی جگہ **خدا**۔ **روز جزا**
اور **یاد خدا** کی تعلیم سب سے اوّل اِنسان کو دی۔ لیکن انسان کی
تادیب وتہذیب ان تین امور حقّہ کے علاوہ ایک اور امر کی بھی
محتاج تھی جو اس کی فطرۃ میں مرکُوز تھا۔ اِنسان کُل امور اکتسابیہ
میں تعلیم سے کہیں زیادہ نمونہ اور مثال کا محتاج ہے۔ ہماری
فطرۃ کی شگفتگی بہت حد تک نمُونہ کی آبیاری چاہتی ہے۔ ہمارے

کُل قوائے فطریہ کا ظہور اور اُن کا نشو ونُما قریب قریب ہماری قُوّت ناقلہ سے وابستہ ہے۔ ایک مادرزاد بہرہ ساتھ ہی گنگ زبان بھی ہوجاتا ہے۔ کیونکہ اس میں عدمِ قُوّت سماعت نے قُوّت تکلّم کو کسی خارجی آواز کی نقل کرنے کا موقعہ نہیں دیا۔ ایّامِ طفولیت میں ہمارے والدین یا پرورش کُنندگان ہمارے نصب العین ہوتے ہیں جن کا نمُونہ ہمیں اپنے قالب میں ڈھال لیتا ہے۔ عمر کے بڑھ جانے پر جس نمُونہ اِنسانی کے ساتھ ارادتاً یا اضطراراً ہماری دلچسپیاں وابستہ ہو جاتی ہیں۔ اُسی کے طریق و آداب ہمیں اپنے رنگ میں رنگین کر لیتے ہیں۔ یہی حال ہمارے اخلاق کا ہے۔ دُنیا نے بہتر سے بہتر قوانین بنا کر قانُون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو ہر طرح سزا بھی دی۔ ایسے طریق بھی برتے جن سے محکُومیں سیاسی طاقت کو یاد بھی رکھیں۔ لیکن بدکرداری کا بیج دنیا سے معدُوم نہیں ہُوا۔ اس کی وجہ یہی تھی۔ کہ ان بدافعال انسانوں کی ابتدائی نشو ونُما بدقماش اور بدوضع اِنسانوں میں ہوئی۔ جن کے بدنمُونہ سے اُنھوں نے حالت سادہ لوحی میں بدعادات حاصل

کیں - ایسا ہی نیک اخلاق کا اکتساب بھی ہر جگہ تعلیم وتادیب سے کہیں زیادہ نیک مثال یا اُسوۂ حسنہ کی پیروی کرنے پر ہی ثابت ہؤا - الغرض انسانی سوسائٹی کی بہبُودی اور فلاح کے لئے اگر سرچشمۂ قوانین - عدالت اور یا وحکومت یا مذہبی اصطلاح میں خُدا - روزِ جزا اور یادِ خُدا ضروریات میں سے ہے - تو ایسا ہی انسانی قوے کی تہذیب اور اُس کے اخلاق کی تعدیل ایک بہترین نمُونہ اور اُسوۂ حسنہ کی مُتقاضی ہے - جس نے ہر سہ امُور بالا کو زیرِنظر رکھ کر تہذیب و تعدیل اخلاق کی ہو - اور جس کے وجُود سے اعمالِ حسنہ اور اخلاقِ فاضلہ کا ظہُور ہؤا ہو - جو دوسروں کا نصب العین ہو کر معاملات زندگی میں اُن کا خضرِ راہ بنے اور اپنے اعلےٰ نمونہ سے مُتّبعین کو اپنے رنگ میں رنگین کر دے یہ وہ صداقت ہے جسے کُل بنی نوع نے ہر شعبۂ زندگی یعنے حرفت میں صنعت میں تجارت میں علم میں اخلاق میں الغرض ہر شاخ معاشرت میں قبُول کیا ہے - اور جس پر ہر فرد بشر کا عملی ایمان ہے لیکن یہ وہ نُکتہ معرفت ہے کہ جسے اگر کسی مُقدّس صحیفے یا ہدایت نامے

نے خواہ وہ ربّانی ہو یا اِنسانی بطور تعلیم و صداقت دُنیا میں سب سے اول پیش کیا تو وہ خدا کی وہی کتاب ہے۔ کہ جس پر کُل الہامی شرائع اور ہدایات کا اختتام ہؤا۔ چُنانچہ قرآن کریم نے اِنسانی فلاح کے لئے حقیقی سرچشمۂ قوانین یعنی خدا۔ حقیقی عدالت یعنے روزِ جزا اور اِستحضارِ حکومت یعنے یادِ خدا کے ساتھ نیک نمونہ کو لازم ملزوم ٹھہرانے کے لئے فرمایا ہے ؛

لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاٰخر وذکر اللہ کثیرًا

اے انسانوں اگر تم اپنی تہذیب و فلاح کی اُمیدیں خدا اور روز جزا کے عقیدہ کے ساتھ وابستہ کر کے آٹھوں پہر خدا کو یاد بھی رکھتے ہو تو تُم کو ایک احسن نمُونہ کی بھی احتیاج ہے۔ اور وہ بہترین نمُونہ تم کو خُدا کے رسول (صلے اللہ علیہ وسلم) کی ذات میں ملجائیگا ؛

قرآن کریم نے اصلاح انسان کی اس حقیقت کو مختلف پیرایوں میں کھولا۔ ایک طرف تو یہ بتلایا کہ جس خدا نے انسانی قوٰے بنائے اور اُن میں ترتیب ابلغ رکھی اُسی خُدا پر انسانوں کا

پہلا حق ہے۔ کہ وہ اُن کے قویٰ کی تربیت کے لئے خود قوانین وضع کر کے مخلوق کو اُن قوانین سے آگہی دے اور پھر خود ہی وہ انسانوں میں سے وقتاً فوقتاً ایک انسان کو اُن تمام قوانین پر چلا کر باقی نسل انسان کے لئے اسے ایک عمدہ اور احسن نمونہ بنا وے۔ یہ وہ باتیں ہیں۔ کہ جن سے ایک عقلمند انسان کو انکار نہ کرنا چاہئے۔ چنانچہ ان امور کو قرآن کریم نے ذیل کی آیات میں پیش کیا ہے ۔

الذی خلق فسوی والذی قدر فھدے۔ فاستقم کما امرت قل انّ صلاتی ونسکی ومحیای ومماتی للہ ربّ العالمین۔ لا شریک لہ وبذالك امرت وانا اول المسلمین قل ان کنتم تحبّون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعاً

وہ وہ **خدا** ہے۔ کہ جس نے مخلوقات کو پیدا کر کے اُسے ایک احسن ترتیب اور نظام ابلغ پر قائم کیا۔ پھر اس کی ترتیب اور نشوونما کیلئے اندازے لگا دیئے۔ اور قوانین سے انسان کو بذریعہ **الہام** اطلاع دی پھر ایک انسان کو حکم دیا کہ تو کل معاملات میں بالکل ٹھیک اسی طرح چل کہ جس طرح ہم تجھ کو چلاتے ہیں۔ اور تُو دنیا کے لوگوں کو اپنے

عمل سے دکھلا دے۔ کہ خدا کے احکام پر اور اُس کے بتائے ہوئے
قوانین پر چلنے میں مَیں نے کُل دُنیا کے مقابل سب سے اوّل اطاعت
کی ہے۔ حتّٰی کہ میرا تو چلنا پھرنا۔ کھانا پینا مرنا جینا میری کُل کی
کُل عبادتیں اُسی خدا کے لئے ہیں جو مخلوق کو پیدا کرتا اور اُسے
نشوونما دیتا ہے۔ اور مجھے تو یہی حکم ہے۔ کہ مَیں اپنی زندگی کا
دستورُ العمل اُسی سے لوں۔ اور اس معاملہ میں اُس کے ساتھ کسی
کو شریک نہ کروں۔ اور اے محمد (صلّی اللہ علیہ وسلم) چونکہ اطاعت
احکامِ الٰہی میں تو سب سے اوّل ہے۔ اس لئے تُو مخلوق کو بھی کہہ دے
کہ اگر تم چاہتے ہو کہ خدا تم سے پیار کرے یعنے تم زندگیاں اسی طرح
گذار سکو جس طرح منشاءِ ربّی ہے۔ تو پھر تم میرے نقش قدم پر چلو
اور مجھے نمونہ بنا کر خدا تعالیٰ نے صرف میرے موجودہ مخاطبین کیلئے
نہیں بھیجا ہے۔ بلکہ مَیں تو کُل دُنیا کے لئے نمونہ ہو کر آیا ہوں کیونکہ
مَیں کُل دُنیا کا رسول ہوں +

کیا ان آیات کا منشا اور ان کا منطوق اس صداقت کو ظاہر
نہیں کرتا جو فطرت انسانی کے عین مطابق حال ہے۔ کیا یہ وہ حقیقت

نہیں کہ جس پر زندگی میں ہم طوعاً وکرہاً چل رہے ہیں - کیا ہماری فطرۃ یہ نہیں چاہتی کہ ہماری آنکھوں کے سامنے بغرضِ پیروی ایک کامل اور مکمّل نمونہ ہو جسّے قوائے انسانی کی نشوونما اور اخلاق کی تربیّت کے عمدہ طریقے معلوم ہوں جو اُن طریقوں پر چل کر خود مُہذّب الاخلاق ہو چُکا ہو اور جو فلاحِ انسانی کی سڑک پر قدم زن ہو کر اُس راہ میں منزل مقصُود تک نہایت روشن نقشِ قدم اپنے پیچھے چھوڑ گیا ہو - اور جو نقشِ قدم اس دوڑ دُھوپ میں دوسروں کی رہنُمائی کریں - ایسا ہی کامل انسان دوسروں کے لئے بغرض پیروی بہتر سے بہتر **نمونہ** ہوسکتا ہے! اور قرآن کریم نے جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی ذات والاصفات کو اُسی قسم کا **نمونہ** ظاہر کیا ہے ؞

اب سوال یہ ہے - کہ کیا نبی کریم کی ذات بابرکات علیہ الصلوٰۃ والتحیات اِنسان کی رہنُمائی کے لئے فی الواقعہ ایک احسن اور عمدہ نمُونہ ہے! اِس سوال کے جواب میں ہم پر اوّل اوّل اُن امور کی تعیین لازم ہوگی جن میں انسان کو نمونہ کی احتیاج لاحق ہوتی ہے -

انسان میں بعض ایسی باتیں بھی ہیں۔ کہ جن کا نشو و نما طبعی طور پر خود بخود ہو جاتا ہے۔ ان باتوں کا زیادہ تر تعلّق ہمارے جسمانیات سے ہے۔ جن میں ہم دیگر حیوانات سے اشتراک رکھتے ہیں۔ لیکن وہ امُور جو ہمیں اس طبقہ ادنےٰ سے ممتاز کرتے ہیں۔ وہ دراصل وہی امُور ہیں جن میں ہم نمُونہ کے محُتاج ہیں۔ یہ ہمارے وہ اخلاق ہیں جو طبعی صُورت میں تو ہر ایک اِنسان کے اندر موجُود ہوتے ہیں۔ لیکن اُن کی تہذیب اور تعدیل ایک تعلیم کی محُتاج ہوتی ہے اور اسی تہذیب و تعدیل اخلاق کا نام کمال اِنسانی ہے۔ ان اخلاق کی تربیت اور اصلاح سے سوسائٹی میں امن پیدا ہو کر ترقّی اور فلاح کے آثار نظر آتے ہیں۔ اور اِنھیں اخلاق کی ناتراشیدہ حالت انسانوں میں چور۔ ڈاکو۔ بدوضع۔ اور بدکردار اشخاص پیدا کر دیتی ہے۔ وہ لوگ جو دُنیا میں بڑے بڑے کام کر گئے وہ وہی تھے جن کے اخلاق نے تہذیب حاصل کی۔ اور وہ لوگ جو ناکام و نامراد رہ کر اپنے لئے اور اپنی قوم کے لئے باعث تباہی بنے وہ وہی تھے جو ان اخلاق کی تعدیل و تربیت نہ کر سکے۔ الغرض اگر ہم عظیم الشّان

انسانوں کی زندگی میں کسی نہ کسی نمونہ کی تلاش کرتے ہیں۔ تو اُنکی جسمانیات میں نہیں بلکہ اُن کے اخلاق اُن کے کیریکٹر اور اُن کی سیرت میں وہ باتیں تلاش کرتے ہیں جنھیں ہم نصب العین ٹھہرا کر اپنی مشکلات میں خضرِ راہ بنائیں۔ لہٰذا قرآن کریم کا یہ فرمانا کہ یہ رسُولؐ کُل دُنیا کے لئے نمُونہ ہے۔ وہ نمونہ زیادہ تر اخلاق کیریکٹر یا سیرت کے لحاظ سے ہی ہے۔ کہ جس کی اتّباع میں ایک انسان اپنے اخلاق سنوار کر اپنے لئے اور اپنے افراد سوسائٹی کے لئے مُفید اور نافع ہو سکے۔ چنانچہ قرآن شریف نے بھی اسی امر کی طرف اشارہ کیا جہاں فرمایا۔ وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ اے محمّد (صلے اللہ علیہ وسلم) تُو ایک عظیم الشّان خُلق پر پیدا کیا گیا ہے +

دُنیا میں جس قدر نبی۔ رسُول۔ رشی۔ اوتار۔ رہنما ہو کر آئے وہ کسی نہ کسی مُلک میں ہمارے لئے اخلاق اور سیرت کا اعلیٰ نمونہ چھوڑ گئے۔ ان میں سے ہر ایک بزرگ دُنیا کی اصلاح کیلئے ایک ایسے وقت آیا جب دُنیا اہل دُنیا کی بداخلاقیوں سے تنگ

تاریک ہو رہی تھی۔ اُنھوں نے ایسے وقت میں اپنے قدسی نفُوس اور پاک نمونہ سے دُنیا کو بد اخلاقیوں سے پاک کر کے اخلاق فاضلہ کا ایک کافی ذخیرہ دُنیا کی ہدایت کے لئے اپنے پیچھے چھوڑا۔ اور چونکہ وہ سب کے سب خُدا کے ہاتھ سے پاک صاف کئے گئے تھے۔ خواہ وہ جناب عیسیٰؑ کی شکل میں تھے یا حضرتِ مُوسیٰ کے لباس میں۔ خواہ اُن کا نام سری مہاراج رامچندر جی تھا یا سری کرشن بھگوان وہ بالضرور مُتّصف باخلاقِ ستُودہ تھے۔ اُنؑ کی مُقدّس زندگیاں اُس وقت بھی اور آج بھی اہلِ دُنیا کے لئے نیک مثال اور اُنؑ کے کارنامے انسان کے لئے بہترین نمونہ ہیں۔ وہ کسی مذہب و مِلّت سے تعلّق رکھتے ہوں۔ اُنؑ کے اخلاقِ حمیدہ اور اعمالِ حسنہ سب کے واسطے آج بھی چشمۂ ہدایت ہیں۔ اطاعتِ والدین میں سری رامچندر جی کا نمُونہ اور دُشمنانِ صداقت کی بیخکنی کے لئے کرشن جی کا جہاد کرنا یہ وہ باتیں ہیں جو اپنے اپنے محل و موقع پر ہر ایک شریف طبع کے لئے قابل پیروی ہو سکتے ہیں۔ مگر جس امر نے مجھ پر قرآن کریم کا یہ دعوےٰ متحقّق کر دیا ہے۔ کہ صرف آں حضرت صلعم کی ذات مبارک

ہی اتباع عالم کیلئے من کُل الوجُوہ کامل نمونہ ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام انبیا و مُرسلین میں اور دُنیا کے تمام رِشی مُنی اور راستبازوں میں سے آپؐ کی مُطہر زندگی اِس قدر جامع واقع ہوئی ہے۔ کہ وہ کُل ضروریاتِ اِنسانی پر حاوی ہوسکتی ہے۔ آپؐ کی زندگی میں وہ تمام حالات مُختلفہ پیدا ہو گئے۔ جن کے ماتحت آپؐ کو کُل اخلاق فاضلہ کے اظہار کا موقع ملا۔ اور اِس طرح جہاں مشاہیر زمانہ کی زندگیاں افرادِ فرادے مختلف رنگوں میں مختلف الحال لوگوں کی پیروی کیلئے عمدہ نمونے پیش کرتی ہیں۔ وہاں آنحضرت صلعم کی ایک ہی زندگی مختلف الحال لوگوں کے لئے حالاتِ مُختلفہ میں کامل ہدایت کا باعث ہوسکتی ہے +

یہ امر ظاہر ہے۔ کہ ہر ایک خُلق کا اظہار ایک محل و موقع کو چاہتا ہے مثلاً عفو کے دکھلانے کا موقعہ کسی اِنسان کو اُسی وقت ملیگا جب اُس کے ستانے والے ذلیل و خوار ہو کر اُس کے سامنے بغرض سزا پیش ہوں اور اُس وقت وہ اُن کے قصور معاف کرے۔ وِالّا وہ اِنسان جس نے عدم استطاعتِ انتقام کے باعث اپنے دشمنوں کو

کچھ نہ کہا ہو صاحبِ عفو کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں۔ شجاعت کے اظہار
کا وقت بھی اس وقت ہوگا جب خطرہ جان کے وقت کوئی شخص
سینہ سپری کرے۔ الغرض محل و موقعہ کے پیدا ہونے پر ہی کسی
خُلق کا اِظہار ہُوا کرتا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ مصلحتِ ربّی
نے حضُور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی زندگی میں وہ تمام مواقع پیدا
کردیئے۔ کہ جن کے ماتحت آپؐ سے تمام کے تمام اخلاق فاضلہ
ظاہر ہوئے۔ ہم یہ تو عقیدہ رکھتے ہیں۔ کہ اگر دیگر مُرسلینؑ اور
اوتاروں کو بھی اِظہار اخلاق مُختلفہ کے محل و موقع ملتے جو ہمارے
اسوہ حسنہ کو مُیسّر آگئے۔ تو وہ بزُرگ بھی بالضّرور اُسی قسم کے
اخلاق دکھلاتے۔ لیکن مشکل تو یہ پڑی ہے کہ اُن بزرگانِ زمانہ
کی زندگی میں ہر ایک خُلق کے اِظہار کے لئے محل و مواقع پیدا نہیں
ہُوئے۔ نہ اُن حالات میں وہ اُستادِ زمن رکھے گئے کہ جن کے
ماتحت اُن کا طریق عمل ہمارے لئے ایک عُمدہ سبق ہوتا۔ اور
بالفرض اگر یہ بھی تسلیم کرلیا جاوے۔ کہ اُن کی زندگی میں بھی شاید
ایسے محل و مواقع پیدا ہو گئے تھے۔ اور اُن سے بھی اُن مواقع کے

مناسب حال اخلاق فاضلہ کا ظہور ہُوا تھا۔ لیکن مشکل تو یہ پڑی ہے
کہ دستبُردِ زمانہ نے اُن تمام کے تمام حالات کو محفُوظ نہیں رہنے دیا
اُن کی سوانح عمریوں میں وہ باتیں ہی ہم کو نہیں ملتیں کہ جن سے ہم کسی
خاص خلق یا سیرت کا پتہ لگا سکیں۔ لہٰذا ناچار ہماری نگاہ اُسی
کامل فرد کی طرف پڑتی ہے۔ کہ جنؐ کی زندگی کے چھوٹے سے چھوٹے
حالات سے لیکر مہتم بالشّان امُور تک اِس وقت محفُوظ و موجُود ہیں۔ اور
اِس لئے کُل رہنما و مُرسلینؑ اور کُل ہادیانِ ہدایت مُختلفہ کے مُقابل
آپؐ کو ہی ایک کامل نمُونہ اور اُسوۂ حسنہ تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ بلکہ
اس معاملہ میں تو کُل مشاہیرِ دُنیا کے مقابل آپؐ کو ایک خارق
عادت خصُوصیّت حاصل ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کو جب ہم
آپؐ کے حالاتِ مأثورہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ تو اِن دونوں میں
ایک عجیب مطابقت ہم کو نظر آتی ہے۔ ایک طرف قرآن کریم
کا کوئی حکم ایسا نہیں جس کی تعمیل آپؐ نے اپنی ذات سے نہ کردی
ہو بالمقابل آپ کا کوئی قول و فعل ایسا نظر نہیں آتا جو قرآن مجید
کے کسی نہ کسی حُکم کے ماتحت نہ آسکے۔ آپؐ کی زندگی دراصل کیا

ہے قرآن کریم کی عملی تفسیر اور قرآن اس کے مقابل آپ کی زندگی
کی کامل تصویر اب اگر کسی انقلابِ زمانہ کے ماتحت بالفرض روئے
زمین سے کُل کی کُل تحریریں مٹ جاویں تو اُس کے ساتھ ہی کُل
مشاہیر کے حالات بھی لازماً صفحۂ ہستی سے مٹ جاوینگے لیکن قرآن
مجید جو قُوّتِ حافظہ کے لکھو کہا مضبُوط صندوقوں میں محفُوظ ہے وہ
آپؐ کے حالات ایسے فنا کُن انقلاب میں بھی دُنیا سے محو نہ ہونے
دیگا۔ یہ وہ خصُوصیّت ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں۔ الغرض کُل ہادیان
زمانہ کے حالات مُطالعہ کر لئے جاویں۔ وہ ایک نہ ایک اخلاق کا
کامل مظہر تو ضرور نظر آتے ہیں۔ اُن کے سوانح ہمارے لئے آج
بھی ہدایت کا باعث ہو سکتے ہیں لیکن اُن میں صرف معدُودے چند
اخلاق کی کیفیات نظر آتی ہیں اور اگر ہم زندگی کی اُن تمام شاخوں
پر نگاہ دوڑائیں کہ جس کے ماتحت افعالِ انسانی کی جماعت بندی
ہو سکتی ہے۔ اور پھر اُن تمام فرائض پر غور کریں جن کے ذمہ وار مختلف
افراد سوسائٹی اپنی اپنی جگہ ہوتے ہیں۔ ایسا ہی اُن تمام اخلاق کا
موازنہ کریں۔ جو انسانوں سے مختلف حادثات زندگی میں ظاہر ہونے

چاہئیں۔ اور پھر اُن تمام امور کی تلاش صرف ایک ہی اِنسان کی زندگی میں کریں تو پھر ہماری نگاہ اگر کسی مُقدّس اِنسان پر پڑسکتی ہے تو وہ صرف آپؐ کی ذات کامل صفات ہے۔ کیونکہ آپؐ کی زندگی میں وہ تمام محل و مواقع پیدا ہوگئے۔ کہ جن کے ماتحت آپؐ سے ایک نہ ایک خلق کا اظہار ہوُا۔ یہ سوال دوسرا ہے کہ وہ خلق بطور نمونہ پیروی کے قابل تھے یا نہیں۔ لیکن یہ بات تو صرف میرے آقاؐ کو ہی حاصل ہے۔ کہ آپ کی **معصوم زندگی** ہمارے لئے زندگی کے ہر ایک شعبہ میں ایک نہ ایک نمونہ مُہیّا کرتی ہے۔ اور میرے نزدیک تو اس رنگ میں بھی مجھے آپؐ خاتم النّبیّین نظر آتے ہیں۔ آخر دُنیا میں کُل انبیا اور ہادی اسی لئے تشریف لائے ہیں۔ کہ ایک طرف جہاں وہ عُمدہ سے عُمدہ تعلیم دنیا کو دیں دوسری طرف اپنے اعمال حسنہ سے قابلِ اتّباع نمونے لوگوں کے لئے قائم کر جاویں۔ اور یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہے جب تک کہ ان مُقدسوں کی زندگیاں ساری کی ساری ضروری نمونے قائم نہ کر جاویں۔ اب اگر تو ہمیں کسی سابقہ ہادی کے

حالات میں کُل کے کُل اخلاق کے نمونے مل سکتے ہوں تو
پھر اُس کے بعد کسی اور نبی کی فی الواقع ضرورت نہیں لیکن
اگر اُن کے حالات اس امر کے مکتفی نہیں تو ہمیں ہدایت
کے لئے کسی اور نبی کی طرف نگاہ اُٹھانی ہوگی۔ اور یہ بات ہم ابھی
لکھ چکے ہیں۔کہ انبیاء سابقہ کے حالات میں یہ ہرگز نہیں پایا جاتا
کہ وہ بزرگ کُل کے کُل ضروری اخلاق کا کامل مظہر تھے۔تو پھر
ان حالات میں کیوں کسی کامل اخلاق والے انسان کی ضرورت
محسُوس نہ ہو۔ یہ تو بالکُل سچ ہے کہ ہر ایک نبیؑ نے کسی خاص
خُلق کا کامل مظہر بن کر گذشتہ انبیاءؑ کی زندگی پر ایک عُمدہ
اضافہ کیا لیکن جب **صاحب الصلوٰۃ** والسّلام نے
سب انبیاء کے بعد ظہُور فرما کر ہر ایک اِنسانی ضرورت کے
لئے راہِ ہدایت کھولی اور انبیاءِ سابقہ کے فرادے فرادے
اخلاق کو اپنی ذات میں جمع کر کے اخلاق کی فہرست میں
ایک بھی خُلق ایسا نہ چھوڑا کہ جس کے اکتساب کے لئے انسان
محتاج نمونہ تھا۔ تو پھر جس غرض کے لئے یہ خدا کے اوتار آیا

کرتے ہیں۔ وہ غرض تو بوجہ اتم آپؐ کی زندگی نے پوری کر دی۔ پھر کوئی وجہ نہیں کہ کیوں آپؐ کو ہر پہلو سے **خاتم النبیین** نہ کہا جاوے اور یہی امر اس بات کی بھی زبردست دلیل ہے۔ کہ جب تک آپؐ جیسے کامل اخلاق کا نبی دُنیا میں نہ آئے سابقہ انبیا علیہ السلام میں سے کسی کا حق نہیں کہ وہ خاتم النبیین کہلائے۔ ہم شرح صدر کے ساتھ یہودیوں کی طرح جناب موسےؑ اور عیسائیوں کی طرح حضرت مسیحؑ اور پارسیوں کی طرح زرتشت علیہ الرحمۃ اور ایسا ہی ہندو احباب کی طرح رامچندر جی مہاراج یا سری کرشن جی بھگوان یا رشیانِ وید کے بعد کسی بھی نبی یا صاحبِ شریعت کی ضرورت نہیں سمجھ سکتے اگر ان رہنمایانِ دُنیا میں سے کسی ایک کی بھی ماثورہ زندگی ہماری ہدایت کے لئے مکتفی ہو۔ لیکن اگر اُن کی زندگیاں کُل ضروریات اِنسانی پر حاوی واقع نہیں ہوئیں۔ یا یُوں کہو کہ اُن کے حالات ہم تک مُکمّل نہیں پُہنچے۔ تو ہم مجبُوراً اُن میں سے کسی بزرگ کو بھی خاتم شریعت کہنے پر مجبور نہیں ہو سکتے۔ مثلاً جب سے انسان نے متمدن زندگی اختیار

کی ہے۔ اس وقت سے آج تک جنگ اِنسانی زندگی سے وابستہ نظر آتا ہے۔ انسانی تاریخ کی ہر شاخ میں جنگ نے زیادہ حصّہ لیا ہے۔ ہر ایک زبان کے علم ادب میں رزمیہ شاخ ہی زیادہ دلچسپ سمجھی گئی ہے۔ یہ امور اس بات پر دال ہیں۔ کہ انسانی زندگی کی ضروریات میں جنگ بھی ہے۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ بجز نبی کریم صلعم کے کس مُقدّس اِنسان کی زندگی جنگ کے مختلف مراحل پر کسی جرنیل یا سپاہی کے لئے بطور نمونہ کام آسکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ راجہ رامچندر اور سری کرشن جی مہاراج نے جنگ کئے۔ لیکن ان کے حالات زیادہ تر خوش کن فسانہ کا رنگ اپنے اندر لئے ہوئے ہیں۔ جناب مسیح کا تو ذکر ہی لاحاصل ہے اُنھوں نے بھی تلواریں تو خریدی تھیں۔ اور اپنے شاگردوں کو جنگ کے لئے طیار تو کر رہے تھے۔ لیکن قضا و قدر کو منظور تھا۔ کہ اہل یُورپ جن کے خزانوں کا بہت سا حصّہ جنگ کی نذر ہو رہا ہے۔ وہ اپنے **خداوند** میں اس ضرورتِ حقّہ پر کوئی نمونہ نہ دیکھ سکیں + ہم تو اس کامل الاخلاق نبی کو **خاتم النّبیّین** کہیں گے

جس کی مُقدّس زندگی نے کُل کے کُل عملی اور اخلاقی نمُونے مُہیّا کر دیئے ہوں۔ ہاں جب ایسا اِنسان دُنیا میں آجاوے تو پھر بیشک کسی اور نبیؑ کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بالکُل سچ ہے۔ کہ دُنیا آٹھوں پہر ایک **زندہ نمونے** کی محتاج ہے۔ لیکن جب تمام ضروری نمونے ایک کی **کامل** زندگی نے مُہیّا کر دیئے۔ تو پھر کیوں یہ ضرورت حقّہ بھی اُسی طرح پُوری نہیں ہوسکتی کہ آیندہ جو مُقدّس **مُعلّم** آوے وہ اُسی خاتم النبین کے نقش قدم پر آوے اُس کی زندگی ایک آئینہ کی طرح ہو جِس میں اُس کامل صفات علیہ الصلوٰۃ والتحیات کے اخلاق و اعمال بطور اثار و اظلال منعکس ہوں۔ اسی طرح اور پہلو پر نگاہ ڈالنے سے اس امر کا بھی قطعاً فیصلہ ہو جاتا ہے۔ کہ کُل کتب حضرت نبی کریمؐ کی بعثت سے پہلے عملی رنگ میں تو ضرور ناقص تھیں۔ اور کم از کم **الہامِ الٰہی** کی عملی تکمیل ایک خاتم النّبیین کی متقاضی تھی۔ یہ کون نہیں جانتا۔ کہ کسی تعلیم کی کامل تشریح و تفہیم عملی نمونہ کی محتاج ہوتی ہے۔ تعلیم کی اصل حقیقت آکر عمل سے ہی کھلتی ہے

اگر تعلیم کے ساتھ مُعلّم کا عمل موجُود نہ ہو تو تعلیم کے غلط سمجھے جانے کا احتمال ہو سکتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اسلام کے ماسوا جس مذہب کو دیکھا جاوے۔ اس کے ماتحت فرقے ایک ہی کتاب اور ایک ہی تعلیم کو ہاتھ میں لے کر اصولاً ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں۔ اُس کی وجہ زیادہ تر یہی ہے۔ کہ اُن تعلیموں کی تشریح میں مُقدّس مُعلّمین کا عملی نمونہ اُن کے سوانح میں نہیں ملتا۔ اُن کے حالات اِس قدر جامع ہمیں مُیسّر نہیں آتے۔ کہ جن سے یہ اخذ ہو سکے۔ کہ اُن کی زندگی میں اُن کی ساری کی ساری تعلیم نے عملی لباس پہن لیا ہو۔ کسی ہادی مذہب قدیمہ کو لے لیا جاوے۔ اس کے مُرّوجہ سوانح سے ہر گز معلوم نہیں ہوتا کہ جو تعلیم اُنھوں نے اپنے پیرووں کو دی اُس ساری کی ساری تعلیم پر وہ خود بھی چل سکے ہوں۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنی تعلیم پر خُود عامل نہ ہونگے۔ مَیں تو ایسا گمان کرنا بھی سُوءِ ادب کیا معصیّت سمجھتا ہوں مطلب میرا یہ ہے کہ اُن کے حالات جو ہمیں آج ملتے ہیں اُن میں ہمیں اُن کی تعلیم کا عملی نقشہ دیکھنا مُیسّر نہیں آتا۔ وید کے مطالب کا سمجھنا گو زبان وید کے مفقود ہو جانے

نے دُنیا پر مشکل کیا محال کر رکھا تھا۔ لیکن اگر آج رشیانِ وید کے کچھ بھی حالات ہم کو معلوم ہوتے۔ اُن کی زندگیاں بالفرض ہمکو تبلاتیں کہ وہ کس طرح یگ وغیرہ کیا کرتے تھے۔ تو آج سوامی دیانند اور سیانہ چاریہ کے تراجم اور دیگر **عقاید** مستخرجہ **وید** میں کیوں زمین آسمان کا فرق پڑتا۔ اور یہ تو بڑا مطالبہ ہے۔ اُن بزرگوں کے مُتعلّق تو ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون تھے؟ کہاں ہوئے؟ کس وضع اور قماش کے اِنسان تھے؟ اُن کا طریقِ عمل کیا تھا؟ رشیانِ وید کے علاوہ دیگر انبیا علیہم السّلام کے حالات تو ضرور ہم تک پہنچے ہیں۔ لیکن مثال کے طور اگر ہم جناب موسٰےؑ۔ جناب داؤدؑ۔ جناب عیسٰےؑ کی زندگی مندرجہ عہدنامجات عتیق وجدید میں یہ دیکھنا چاہیں کہ جو کچھ توریت۔ زبور اور انجیل میں اوامرونواہی دیئے گئے ہیں۔ وہ خود اُن مُعلّمین علیہم السّلام نے اپنی زندگی میں ملحُوظ رکھے یا نہیں تو یہ تلاش بالکل بے سُود ہوگی۔ ہاں الہام قرآن کا مُلہَمؐ ہی ایک ایسا عامل بالقُرآن مُعلّم ہمیں نظر آتا ہے۔ کہ جِس طرح قرآن نے اُسکی شان میں کہا۔ اُسؐ نے ویسے ہی سچ کر دکھایا

يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيۡهِمۡ

یعنے یہ رسولؐ نہ صرف اُن لوگوں کو قرآن کے احکام ہی سُناتا ہے بلکہ اُن کی اصلاح اور تطہیر کے لئے اُن احکام پر خُود عامل ہو کر اُنکی اصلاح بھی کرتا ہے +

الغرض قرآن کریم کی تعلیم کا ایک شوشہ بھی ایسا نہ ہوگا کہ جس کا عملی نقشہ آپؐ کی زندگی میں نظر نہ آئے۔ جناب عائشہؓ صدیقہ سے کسی نے آنحضرت صلعم کی معاشرت خانہ داری کی کسی شاخ کے متعلق کچھ دریافت کیا تو صدیقہؓ نے قرآن کی ایک آیت کی طرف ہی اشارہ کر کے فرمایا۔ کہ کیا قرآن میں یہ امر نہیں دیکھا؟ کیونکہ آپؐ کا فعل تو وہی تھا جو حکمِ قرآن ہے۔ اِسی طرح جب صدیقہ سے ایک اَور موقع پر کسی آیت کی تشریح ایک اَور صحابی نے دریافت کی تو صدیقہؓ نے فرمایا کہ تم نے نبی کریم صلعم کا عمل اِس طرح کا نہیں دیکھا؟ وہ عمل اس آیت کے ماتحت تھا؟ یہ وہ امر ہے کہ جو کسی مُقدّس کتاب یا مُقدّس صاحبِ کتاب کو نصیب نہیں۔ قرآن کریم سے پہلے ایک بھی پاک صحیفہ ہمیں ایسا نظر نہیں آتا۔ کہ جس کے لانے والے نے اپنی زندگی میں صحیفۂ مذکور کے

کُل کے کُل احکام کو عملاً کر دکھلایا ہو۔ اب اگر تعلیم کی اصلی حقیقت عمل سے ظاہر ہوتی ہے۔ اور ہر ایک انسان میں قدرتاً اس بات کی تڑپ ہے، کہ جو تعلیم اس کو ہدایت کے رنگ میں دی گئی ہو۔ وہ عملی لباس میں بھی اس کے سامنے ہو۔ اور یہ طبعی پیاس قرآن کے سوا کسی اور چشمۂ الہامِ ربّانی سے بُجھتی نظر بھی نہیں آتی۔ تو پھر کس طرح ہم مان لیں کہ قدیمہ الہام زمانہ کیلئے مُکتفی تھے۔ بالفرض اگر وہ اَور طرح ناقص نہ تھے تو کیا عملی رنگ میں بھی مُحتاجِ تکمیل نہ تھے۔ میرے دل میں بسا اوقات یہ خیال گذرا ہے۔ کہ اس بات کا عقیدہ رکھ کر بھی کہ جو کچھ انبیا علیہم السّلام نے سکھلایا ہوگا وہ خُود ضرور کر کے دکھلایا بھی ہوگا۔ لیکن جب زمانہ نے اُن کے حالات محفُوظ نہ رکھے۔ ایک طرف اُن کی تعلیمات مخدوش ہوگئیں۔ دوسری طرف اگر کوئی تعلیم اپنی اصلی شکل میں موجُود بھی رہی۔ تو اوّل تو اُس کا مفہوم مشکل کیا محال ہوگیا۔ اور پھر اُس تعلیم کا عملی رنگ تو بالکُل ہی مفقُود ہو گیا۔ اب اگر یہ انبیا اور خُدا کے اوتار اِس لئے دُنیا میں آئے۔ کہ وہ اِنسانی زندگی کی علّت غائی خالق اِنسان سے معلُوم کر کے اُس علّت غائی کے حصُول کے طریق سے انسان کو اطّلاع دیں۔ اور پھر اُس طریق پر خُود عمل کر کے

اپنے سوانح بطور نمونہ دوسروں کے لئے چھوڑ جاویں تو جب مصلحتِ ربّی نے اُن انبیأ کے کامل حالات صفحہ ہستی سے محو کر دیئے۔ اور ان میں صرف ایک ہی انسانؑ کی جہاں تعلیم محفوظ رکھّی۔ وہاں اُس کی زندگی میں اُس کی ساری کی ساری تعلیم کو عملی جامہ پہنایا اور اُنکی زندگی کے ادنٰے واقعہ سے لیکر مہتم بالشّان امور تک تاریخ کے ذریعہ محفوظ کر دیئے۔ اور یہ وہ بات ہے جو کسی اور ہادی میں ہمیں نظر نہیں آتی۔ تو کیوں ہم نتیجہ نہ نکال لیں۔ کہ کُل انبیأ کے بعد منشاءِ ایزدی یہی تھا کہ نبی آخر زمانؐ ہی کُل دُنیا کی ہدایت کا اُسوہ حسنہ اور کامل نمونہ ٹھہرے۔ اور یہ تو وہ بات ہے جس کو تسلیم کرنے کے لئے قوانین قُدرت ہمیں ہر وقت مجبور کرتے ہیں۔ قدرت کا ہاتھ کسی چیز کو اُسی حد تک زمانہ میں قائم رکھتا ہے۔ جس حد تک کہ وہ چیز دوسروں کے لئے نفع رساں ہو سکے۔ اور جو چیز اِنسان کے لئے مستقل طور پر نفع بخش نہیں ہوتی۔ اُس کا وُجود تھوڑے عرصہ کے لئے ہی قائم رکھا جاتا ہے۔ اب اگر یہ وہ امر ہے جسے واقعاتِ عالم نے ثابت کر دیا ہے تو کیا روئے ہستی سے نبی کریم صلعم کے سوا کُل ہادیانِ ممالکِ مختلفہ

کے حالات کو محو کر دینا ایسا ہی قرآن کے سوا باقی کُل کُتب مقدسہ کو
اصلی حیثیّت میں نہ رہنے دینا یا اُن کی زبانوں کو زمانہ سے مٹا کر
اُن کو ناقابلِ فہم کر دینا اِس بات کا ثبوت نہیں کہ قرآن کریم کے
سوائے دیگر کُتب اور آنحضرت صلعم کے سوا دیگر بزرگانِ زمن کے
حالات **خدا** کے علم میں دوامی طور پر نافعُ النّاس نہ تھے۔ قرآن کریم
نے کیا لطیف طور پر اس اصُولِ حقّہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فامّا
ماینفع النّاسَ فیمکث فی الارض یعنے وہی امرِ دُنیا میں قائم رکھّا
جاتا ہے جو اِنسان کے لئے نفع رساں ہو۔ **اللہ اللہ** ابھی کل کی بات
ہے کہ سوامی **دیانند** ہم میں ہُوئے اور ریفارمر کے رنگ میں آئے
اُنھوں نے ویدک مذہب اور ویدک زندگی کا پرچار کیا۔ اُنھوں نے
ہندوؤں میں ایسی روح پھونکنی چاہی۔ کہ وہ ہر رنگ میں ویدک زندگی کو
اختیار کریں۔ لیکن زمانہ نے اُن کے حالات کو محو کر دیا۔ اگر ہم سوامی
کی زندگی میں عملی مثال کی تلاش کریں اور یہ دیکھنا چاہیں کہ سوشل یا
ڈومیسٹک یا پولیٹکل امُور میں وید نے ہمیں کیا تعلیم دی ہے تو ہمیں
مُلہمانِ وید کی طرح اِس جدید مثال میں بھی مایُوسی ہو جاتی ہے۔ ہمیں

یہ تو ضرور نظر آتا ہے۔ کہ ایک شخص سنیاس کا رنگ اختیار کئے ہوئے تھا لیکن کُل دنیا تو سنیاس کے لئے نہیں بنی۔ اور مجھے تو سمجھ نہیں آتی کہ یہ اصحاب **گُروکُل** بھگوے کپڑے پہنا کر ہمیں سکھلانا کیا چاہتے ہیں؟ کیا ہم موجودہ طریق معاشرت کو چھوڑ کر آج سے کئی ہزار برس پہلے کی لنگوٹ بند زندگی اختیار کرینگے. جب کہ اہل ہند کسی مذہبی تعلیم یا اقتصادی اصول پر نہیں بلکہ شاید محض عدمِ استطاعت یا عدم علم پارچات یا کافی کپڑے کے نہ ملنے سے برہنہ بدن رہتے تھے؟ العجب ثم العجب۔ اِس جگہ ایک اور امر بھی قابل ذکر ہے۔ کہ جس سے کوئی سلیم الفطرۃ طبیعت آنحضرت صلعم کی تعریف و توصیف کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بالفرض اگر ہماری زندگیوں کے مُتعلّق یہ التزام ہو جاوے۔ کہ ہمارے سب کے سب حالات کسی طریق پر پبلک میں آجایا کریں۔ مثلاً کوئی اِس قسم کے کراماً کاتبین ہم پر ماموُر ہو جائیں کہ جو اُن تمام اقوال و افعال کو جو ہم سے آٹھ پہر سرزد ہوتے ہیں قلم و کاغذ کے حوالہ کر کے پبلک میں بھیج دیا کریں تو ہزاروں کیا لاکھوں میں سے کوئی ایک آدھ ہم

ہیں سے ایسا نکلے تو نکلے جو بلحاظ اخلاق و اعمال اس کڑے امتحان میں پُورا اُترے۔ وہ بیشمار اِنسان جو اِس وقت سوسائٹی یا منصب کی وجہ سے یا دوسری مجبُوریوں کے باعث عام نگاہوں میں نیک زندگی بسر کرتے نظر آتے ہیں۔ نہ معلوم ایسی آزمائش کے وقت کیسے سیہ کار اور بدکردار ثابت ہوں۔ ہم کیوں نہ اپنی زندگیوں کا احتساب خود کرلیں ہم میں سے کتنے ہیں جو اُن باتوں کے دوسرے تک پہنچنے کے خیال اور وہم سے بھی کپکپا نہیں جاتے جو ہم سے خاص اوقات میں بلا تامل سرزد ہو جاتی ہیں۔ ان امُور کا ذکر ہی کیا جن کا ارتکاب ہم رات دن عالمِ تنہائی میں کیا کرتے ہیں۔ اگر ہماری وہ باتیں جو ہم بے تکلف مجلس احباب میں کیا کرتے ہیں کسی اخبار میں چلی جاویں تو ہم میں سے متین سے متین سنجیدہ سے سنجیدہ اور متّقی سے متّقی شہرت کے انسان بھی بازیچۂ طفلان میں مبتلا اور بدوضعی اور بدقماشی کے خصائل میں مُنہمک نظر آئیں۔ اللہ اللہ وہ اِنسانؐ کس قدر زبردست کیریکٹر اور مکمّل اخلاق سے مُتّصف اِنسانؐ ہوگا کہ جِسؐ کے کُل کے کُل حالات کیا اندرونی کیا بیرونی حتّٰے کہ اُسؐ کی معاشرت کے

وہ طریق جو اُس نے اپنے گھر میں اپنی بیویوں سے مخلّی بالطبع وقتوں میں بھی برتے وہ تو سب کے سب پبلک میں آجاویں۔ اور وُہ اخلاق فاضلہ اور سیرت کاملہ کی اس بلند چوٹی سے ایک انچ بھی نیچے ہوتا ہؤا نظر نہ آوے۔ کہ جس پر شُہرتِ دوام نے اُسے بٹھا رکھا ہے۔ خود اُس کو اپنے اعمال و اخلاق پر کس قدر اطمینان اور بھروسہ ہے۔ کہ جہاں اور انسان اس فکر میں رہتے ہیں۔ کہ اُن کے بعض حالات اُن کے سوا کسی اَور کو معلوم نہ ہوں۔ وُہ اپنے اندر سے اندر کے حالات کو طشت از بام کرنے میں راحت اور سرور حاصل کرتا ہے اور وُہ اپنی ازواجِ مُطہرات کو حکم دیتا ہے۔ کہ جو کچھ وہ اس سے دیکھیں اُس کو عام لوگوں تک پُہنچائیں۔ بلکہ اُس کے متعدّد نکاح کرنے کی بھی ایک بھاری وجہ یہی تھی۔ کہ اُس کی اندرونی معاشرت اور خانہ داری سے دُنیا واقف ہو جائے ✤

اِس ہمارے زمانہ میں بھی تو ہر مذہب و ملّت نے ذی وجاہت انسان پیدا کر رکھے ہیں۔ اور وہ سب کے سب پارسائی اور نیکی کے مدّعی ہیں۔ لیکن اُن میں سے کتنے اِس بات کو گوارا کر سکتے ہیں

کہ کوئی اخبار نویس اُن کے تمام حالات اور کلمات لکھ کر
چھاپ دیا کرے۔ ہاں اس تجربہ کے نیچے وہی آنا پسند کرے گا
جو ربّانی رنگ اپنے اندر رکھتا ہو۔ یعنی جو خُدا تعالےٰ کے
ہاتھ سے پاک صاف ہو کر مُتّصف باخلاقِ حمیدہ کیا گیا ہو۔ یہ
جُرأت تو اُنہیں لوگوں کو ہوتی ہے جن کی زندگی آٹھوں پہر
ایک قسم کی خفی وحی کے ماتحت ہوتی ہے۔ ہمارے غیر اسلامی
دوست جنھیں اِدّعاے نقّادی ہے۔ اگر تنقید کے وقت امورِ بالا
کو ذہن نشین کر کے شارِع اسلام علیہ السّلام کے حالات پر غور
کریں تو ممکن نہیں کہ اُن کے دل احسنت احسنت اور مرحبا مرحبا بول
نہ اُٹھیں۔ ہم صاحب الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی بانی یا بزرگ مذہب
پر رائے ہی کیا قائم کریں کہ جب ہمارے سامنے اُن کی زندگی
کے مُکمّل تو درکنار جستہ جستہ حالات بھی موجود نہیں ؛

رشیان وید کے حالات سے تو ہم مُطلق واقف ہی نہیں۔ اور
دیگر جن کے تھوڑے بہت حالات ہم کو معلوم بھی ہیں۔ اگر قرآن
اُن کی نبوّت کی تصدیق نہ کرتا تو شاید ہمارے موازنہ میں وہ نبی

بھی کہلانے کے مستحق نہ ہوتے۔ باقی انبیاءؑ میں سے جناب مسیحؑ کو ہی
لے لو۔ اگر اُن کے حالات مندرجۂ اناجیل اربعہ میں سے اُن کی عملی
زندگی اخذ کرلی جاوے تو شاید دو تین ورق کے اندر اندر ختم ہو جاوے۔
کون کہہ سکتا ہے۔ کہ یہ بزرگ ہم کو کیا نظر آتے اگر اُن کے کل کے
کل حالات ہماری نگاہ تلے ہوتے؂

اس معاملہ میں بڑی بھاری غلطی جو عامۃ النّاس چھوڑ اہل الرائے
اصحاب سے بھی ہو جاتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ یہ لوگ تعلیم اور عملی نمونہ میں
فرق نہیں کیا کرتے۔ جب ہم کسی خاص سیرت یا عملی نمونہ کی تلاش
کسی مصلح ربّانی کی زندگی میں کرتے ہیں۔ تو اُس کے ماننے والے
فی الفور ہمیں اس بزرگ کے ملفوظات میں سے اُس حصۂ تعلیم کو
نکال کر پیش کیا کرتے ہیں۔ کہ جس میں اس نے اپنے پیروؤں کو وہ
سیرت یا عمل اختیار کرنے کی تعلیم دی ہو۔ اور اُس کے ساتھ یہ بھی
فرض کرلیا جاتا ہے کہ اُس نے ویسا ہی کیا بھی تھا۔ جیسے کہ تعلیم دی
تھی۔ مطالبہ تو فعل کا ہوتا ہے۔ اور پیش قول کیا جاتا ہے عقیدہ
یا حُسن ظن تو امر دوسرا ہے۔ لیکن یہ امور مُورّخانہ تنقید کے صریح خلاف

ہے ۔ہم کو بار بار کہا جاتا ہے ۔کہ یسُوع دُنیا کی رہنُمائی کے لئے ایک
بے نظیر اور قطعی اور لاشریک نمونہ ہے ۔لیکن جب ہم اُن واقعات
کی جانچ پڑتال کرتے ہیں ۔کہ جن سے ہم یہ اخذ کر سکیں کہ جناب
مسیح کس طرح اور کن حالات میں ایک کامل نمونہ تھے یا آج ہو سکتے
ہیں ۔تو ہمیں سرمن آف دی مونٹ یعنی زیتون کی پہاڑی والا خُطبہ
یا بعض ملفُوظاتِ یسُوع مندرجۂ اناجیل اربعہ سُنائے جاتے ہیں ۔
کیا اِس قسم کا سبق ہمیں گلستاں بوستاں ۔پند نامۂ عطار بھگت کبیر
کے شبدوں اور حضرت نانکؒ کے ستّ بچنوں میں نہیں ملتا ۔
اعتقاداً تو ایک شخص مان سکتا ہے ۔کہ یسُوع خُود ایسا ہی ہو گا
جیسے کہ اُس نے دوسروں کو ہونے کے لئے کہا ۔لیکن ہم تو عملی نمونہ
کے طالب ہیں ۔ہم تو وہ واقعات دیکھنا چاہتے ہیں کہ جن کے
ماتحت آپ نے اپنی تعلیم کو اپنے وجُود سے عملی لباس پہنایا ۔مثلاً
کب اور کس موقعہ پر معناً یا مجازاً آپ کی گال پر کسی نے طمانچہ مارا
اور آپ نے بخوشی دوسرا رُخسارہ بھی اُس کے آگے رکھ دیا ۔
ہم نے تو انجیل میں برعکس ہی دیکھا ۔جب جھودی فریسی آپ سے

مقابل آئے اور گو بظاہر ملائمت سے پیش آکر نشان کے خواہاں ہوئے
لیکن آپ نے اُنھیں شیطان اور سانپ کے بچّے ہی قرار دیا۔
حضرت مسیحؑ بیشک صبر اور حلم اور کسی حد تک استقامت کا عُمدہ
سبق دُنیا کو دے گئے۔ لیکن دیگر اخلاق کے کامل نمونے آپ کی زندگی
مندرجہ بائبل میں تلاش کرنا ایک بے سُود امر ہے۔ ہاں اس معاملہ
میں جناب رسالتمآب علیہ الصلوٰۃ والسّلام دُنیا کے لئے ایک کامل
اسوۂ حسنہ ہیں۔ آپؐ قضا و قدر کے ہاتھوں ایک یتیمی کی
زندگی سے بادشاہت کی زندگی تک پُہنچائے گئے۔ اور اُن دو متضاد
زندگیوں کے درمیان آپؐ پر وہ تمام کے تمام حالات گُذر گئے جو
مختلف الحال لوگوں پر وارد ہُوا کرتے ہیں۔ اور ان حالات مختلفہ
کے ماتحت آپؐ سے ان تمام اخلاق کا ظہور ہُوا۔ جن کا جمع کرنا ایک
ہی زندگی والے انسان میں محال تھا۔ بلکہ بعض وقت تو آپؐ پر
اس قسم کے حالات بھی وارد ہوئے جو کسی خاص خلق کے اظہار کے
سخت مانع تھے لیکن آپؐ ان تمام امتحانات میں کامیاب نکلے۔ اور
دراصل غور کیا جاوے تو کسی اخلاق فاضلہ کا قابل نمونہ ظہور بھی

اُسی وقت ہوتا ہے۔ کہ جب اِنسان کے حالات ناموافق ہوں اور اُس اخلاق کے ظہُور کے موانعات کثرت سے پیدا ہوجائیں۔ ایک شخص دعوے کرسکتا ہے۔ کہ اُس نے کبھی دروغ گوئی نہیں کی اور ممکن ہے کہ ایسا ہو۔ لیکن وہ راستبازی جیسے اخلاق فاضلہ کا کبھی مُدّعی نہیں ہوسکتا جب تک وہ کسی خاص امتحان میں نہ ڈالا جاوے۔ اور جبتک اُس کے مُتعلّق یہ امر ثابت نہ ہوجائے۔ کہ اُس نے ایسے وقت بھی راست گفتاری کو نہ چھوڑا جبکہ سچ بولنے سے اُس کی جان و مال یا عزّت معرض خطر میں آتی تھی +

مثلاً اگر کوئی شخص کسی سنگین فوجداری مُقدمہ میں بجواب استفسار عدالت ایسے اُمور کو خُود تسلیم کرے جو اُس کی مُجرمیّت کے لئے بظاہر کافی ہوں یا کسی دیوانی مقدمہ میں بطور گواہ خود وہ باتیں بفرض محال قبول کرلے جو اُس کے مخالف کے تو دعوے کو ثابت کریں۔ حالانکہ فریق مخالف کسی اور طریق پر اُن باتوں کو ثابت بھی نہ کرسکتا تھا تو بیشک ایسا شخص راستباز کہلانے کا مستحق ہے۔ ایک دولتمند اگر امین ہونے کا دعوے کرے تو یہ دعوےٰ اس کے مناسب حال

نہیں۔ امین حقیقی وہی ہے جو مُفلسی اور قلّاشی میں اور سخت احتیاج میں کسی بکیس عورت کے مال و دولت کا مُحافظ مقرر ہو اور پھر وہ اپنے فقر و فاقہ کی موجودگی میں ایسے مال کی حفاظت کیلئے امانت و دیانت کو ہاتھ سے نہ دے۔ اِس فلسفہ حقّہ کو سعدی نے کیا موزونیت کے ساتھ خُلق تواضع کے متعلّق بیان کیا ہے ؎

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا اگر تواضع کُند خُوئے اوست

دراصل کسی اخلاق فاضلہ کے اِظہار کا حقیقی وقت بھی وہی ہوتا ہے۔ جب نواحی حالات ایسے اظہار کے مُخالف واقع ہوں حضرت **نبی کریم** صلوٰۃ اللہ علیہ عارف **گوتم**ؑ اور شری مہاراج **رامچندر** جی کی طرح ایک بادشاہی گھر میں اس لئے پیدا نہ ہوئے کہ آپؐ غربت اور مسکینی میں رہ کر سخت احتیاج میں بھی کامل سیرچشمی کا ثبوت دیں۔ بیشک جناب مسیحؑ آپؐ کے ساتھ اِس تنگدستی اور مسکینی کی زندگی میں شریک حال ہیں۔ لیکن میرے آقاؐ کی طرح مسیح علیہ السلام کے پاس تنگدستی و مفلسی میں دوسروں نے مال و دولت

بطور امانت سپرد نہیں کیا۔ اور اس طرح آپؐ کی طرح جناب مسیحؑ کو **امانت و دیانت** جیسے جوہر کے اظہار کا موقع نہیں ملا۔ آپؐ کی راہ میں خطرناک مشکلات اور جانکاہ تکالیف پیدا ہوئیں۔ آپؐ کو ایک امر حقّہ کے قائم کرنے کے لئے ہر قسم کے مفاد اور طرح طرح کی آسائشیں قربان کرنی پڑیں۔ تاکہ آپؐ دنیا میں ایک ایسے اعلےٰ قسم کا نمونہ **استقامت** دکھلا سکیں۔ **صبر و تحمل** کے اظہار کے لئے آپؐ حضرت موسٰےؑ حضرت عیسٰےؑ اور ایسا ہی شری رامچندر جی مہاراج کی طرح دشمنوں سے ستائے گئے۔ لیکن آپؐ کے دشمن اور آپؐ کے ستانیوالے مغلوب ہو جانے پر نہایت ذلیل حالت میں آپؐ کے سامنے لائے گئے اور آپؐ سے رحم کے ملتجی ہوئے۔ تاکہ ایسے وقت میں آپؐ **عفو** کا ایک کامل نمونہ دنیا میں قائم کر جاویں۔ اور یہ وہ امر ہے۔ کہ جس کے لئے مذکورہ بالا ہر سہ بزرگوں کو موقعہ نہیں ملا۔ آپؐ شری رامچندر جی اور شری کرشن جی مہاراج کی طرح جنگوں میں بھی گئے نہ اس لئے کہ اظہار شجاعت میں آپؐ میدانوں کے

میدان صاف کردیں۔ خاندانوں کے خاندان روئے ہستی سے مٹا کر
باپ بلا اولاد اور بچےّ یتیم مرد رنڈوے اور عورتیں بیوہ کردیں۔ بلکہ
خلق شجاعت کے اظہار کے علاوہ آپ نے جنگوں میں وہ قابل
اقتدا نمونے بھی قائم کرنے تھے کہ جن کی ایک فرماں روا ملک کو جنگ
سے پہلے جنگ کی ضرورت تسلیم کرنے کے لئے اور پھر جنگ کے
چھڑ جانے پر اور جنگ کے خاتمہ پر ایک جرنیل یا سپاہی کو مختلف
مواقعات جنگ کے مناسب حال ہر وقت ضرورت ہوتی ہے۔
زُہد یا دُنیا سے انقطاع بھی ایک عملی نمونہ چاہتا تھا لیکن نبی عرب
علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عارف بُدھ کی طرح سلطنت چھوڑ کر اور
تمدنی زندگی کو تیاگ دے کر بادیہ نشینی اختیار نہ کی۔ بلکہ آپؐ نے
دُنیا میں رہ کر دُنیا سے قطع تعلّق کیا۔ آپؐ نے اگر دُنیا میں منہمک
ہونے سے پرہیز کیا تو دوسری طرف دُنیا کو اپنے قوےٰ سے
مُستفید ہونے سے بھی محروم نہ کیا۔ اور ضرور تھا کہ آپؐ ایسا کرتے
کیونکہ اس کے خلاف کرنے میں ان قوائے انسانی کا خُون ہونا تھا
جو مختلف انسانوں میں خدا تعالیٰ نے ایک دوسرے کی خدمت

کے لئے ودیعت کر رکھے ہیں۔ ہم سب مُدنی بالطبع ہیں۔ ہم سب کو
یہ قدرت نے مختلف قوے اس لئے بخشے ہوئے ہیں۔ کہ اُن کے
استعمال سے ہم ایک دوسرے کی راحت اور آسائش بڑھا سکیں۔
عارف باللہ گوتم نے جس زہد کو اختیار کیا۔ وہ فی الواقع زمانی مکانی
ضروریات کے لحاظ سے عین مناسب تھا۔ اس وقت کے ہندوستانیوں
کا دنیا کے مردار پر رات دن جُھکے رہنا ایک ربّانی مصلح سے ایسی ہی
قربانی چاہتا تھا جو عارف باللہ گوتمؑ سے ظہور پذیر ہوئی۔ لیکن بُدھ
کا نمونہ اپنے اندر عملی مداومت نہ رکھ سکتا تھا۔ اہلِ دُنیا دُنیا میں
ہی رہنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں۔ اور اسی جگہ رہ کر وہ کمال حقیقی
کو حاصل کر سکتے ہیں۔ بُدھ مذہب کے پیرو بھی کروڑوں تک پہنچ گئے
لیکن اُس زہد کو اختیار نہ کر سکے جس کا نمونہ ان کے مرشد نے قائم
کیا نہ کسی نے گھر چھوڑا نہ سلطنت کو جواب دیا۔ اور آج جو انسانی
آسائش کے لئے اس قدر ترقّی کے سامان ہم چاروں طرف دیکھ رہے
ہیں یہ کب پیدا ہو سکتے تھے۔ اگر عارف بُدھؑ کے نمونہ پر عمل درآمد
ہوتا۔ لیکن اس کے مقابل رُو بدُنیا ہی ہو جانا اور جیفۂ دُنیا پر

آنکھوں پہ منہ مارنا ایک ذمیمہ حرکت اور رذیل فعل تھا۔ اسلئے ضروری تھا کہ وہ اُسوہ حسنہ جو کُل دُنیا کی رہنمونی کے لئے سب سے آخر آیا ایک نمونہ قائم کرے۔ کہ کس طرح ایک اِنسان ابناءِ دُنیا کی خدمت کے لئے دُنیا میں رہ کر دنیا سے انقطاع کر سکتا ہے۔ عیسائی دُنیا نے اس بات پر زور دیا ہے۔ کہ ہم اپنی ہدایت کے لئے جناب مسیح علیہ السلام کو ایک کامل نمونہ سمجھیں اور اُن کے قدم بقدم چلیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ بعض حالات میں ہمارے لئے پاک نمونہ ہو سکتے ہیں۔ وہ حلم میں بُردباری میں ایسا ہی ایک حد تک صبر و استقامت اور شاید ایثار میں بھی اہل دُنیا کے لئے ایک عمدہ نمونہ اور قابلِ اتّباع مثال ہوں لیکن مشکل تو یہ ہے۔ کہ اہلِ زمانہ کثرت سے متاہل ہیں اور کوئی گھر اولاد سے عموماً خالی نہیں ہوتا۔ یہ بھی ہر روز تجربہ میں دیکھا جاتا ہے۔ کہ ایک صاحبِ عیال کے لئے اُس کا عیال اسی دنیا میں بہشت یا دوزخ اس کے لئے پیدا کر دیا کرتا ہے۔ ہم سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں گھروں کو عورت خاوند کے ناخوش کن تعلّقات سے دوزخ کا نمونہ بنے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اور یہ بھی مُسلّم ہے کہ گھر کے اچھّے تعلّقات

اور خانہ داری کی عُمدہ معاشرت سارے دن کی کوفت کو راحت میں متبدّل کر دیا کرتی ہے۔ پھر اولاد کے معاملہ میں بعض گھروں میں اولاد بڑی ہو کر بدچلن ہو جاتی ہے۔ والدین کی تلخ کامی یا خُوشوقتی اولاد کے چال چلن پر بہت کچھ منحصر ہے۔ اور یہ اُس تربیّت سے وابستہ ہوتی ہے جو بچّے اپنے بڑوں سے حاصل کرتے ہیں۔ الغرض کُل دُنیا کو چھوڑ کر اگر گھر میں راحت مُیسّر آ جاوے تو بیرونی دُنیا کی کُل تکالیف ہیچ ہوتی ہیں۔ اور اگر خانگی تکالیف لاحق ہوں تو باہر کی سب آسائشیں بے سُود۔ کیا ہم کو اس دمِ نقد بہشت حاصل کرنے کی ضرورت نہیں۔ جو معاشرت خانہ داری سے وابستہ ہے۔ اب وہ کون سے طریق آداب اور قواعد ہیں جو کسی کامل اِنسان نے اپنی زندگی میں اختیار کر کے ہمارے لئے نمونتہً قائم کر دیئے ہوں۔ کہ جِن کو اختیار کر کے ایک اِنسان اس خانہ داری کی زندگی کو اپنے لئے بہشت بنا لے۔ وہ کونسا پاک نمونہ اور اُسوۂ حسنہ ہے۔ جو اِن مشکلات میں ہمارا ہادیٔ راہ ہو۔ کیا وہ نمونہ وہ طریق وہ آداب ہم جناب مسیحؑ کی زندگی میں پا سکتے ہیں۔ کہ جِن کی خبر سے

نہ شادی ہوئی نہ بچّے ہوئے۔ مرنے کے بعد جو شفاعت ہماری
مسیحؑ کرینگے وہ تو دیکھ لیا جاویگا۔ ہمیں تو سردست اِس دُنیا میں
شفاعت کی ضرورت ہے۔ کیا ایک اِنسان اس دقّت کو رفع کرنے
کے لئے جناب مسیحؑ کی طرف دیکھے یا اُس مُقدّسؐ اور کامل انسان کے
نمونہ کی اِتّباع کرے۔ جِسؐ نے خیرکم خیرکم لاھلہٖ کا عُمدہ سبق
دنیا کو دے کر اپنیؐ اعلےٰ معاشرت خانہ داری سے اپنے مُتعدّد گھروں
کو فردوسِ بریں کر دیا۔ جِسؐ نے اولاد کی تربیّت اور اصلاح کیلئے
وجعلنا للمتقین اماما کی دُعا سکھلائی۔ اور اکرموا اولادکم
کا نہ صرف حکم دیا۔ بلکہ خُود اُس پر عمل کر کے دکھلایا۔ کہ اگر تم اپنی اولاد
سے خوش رہنا چاہتے ہو یا خواہش رکھتے ہو کہ تمہاری اولاد دُنیا
میں صاحبِ عزّت اور ذی وقار ہو تو اُن میں خُودداری کا مادّہ پیدا
کرنے کے لئے ان کی عزّت تم خود کرو۔ اپنی اولاد اور اپنی اولاد
کے متعلّقین کا اکرام کرو۔ اور اُن کے خیالات کی عزّت کرو۔ ایسا
ہی اگر تم چاہتے ہو۔ کہ وہ نیک چلن اور خُوش کردار بن جاویں تو
اُن کی پیروی کے لئے خُود نیک چلن اور خوش کردار بنو کیونکہ

وجعلنا للمتقین اماماً میں اشارہ یہی کیا گیا ہے۔ الغرض کسی پہلو سے سوال زیر بحث پر غور کیا جاوے بجز نبی کریم صلے اللہ علیہ وسلم کوئی اور بزرگ یا ہادی ہمیں نظر نہیں آتا جو ہر دِقّت کے وقت اپنی عملی مثال سے ہماری عُقدہ کُشائی کرے۔ اور جس نے ہر ایک اخلاق فاضلہ میں ایک کامل نمونہ ہمارے لئے قائم کر دیا ہو۔ یہ ابھی لکھا جا چُکا ہے۔ کہ کسی کے اخلاق کا امتحان بھی اس وقت ہو سکتا ہے۔ کہ جب اس اخلاق کے اظہار کے مناسب حال حالات موجود ہوں یعنی نواحی حالت اس خُلق کے ظہور کی ممد ہو جانے کی بجائے اُس خُلق کو دبا دینے کی متقاضی ہو۔ ایسے حالات میں ہی خلق مطلوبہ کا اظہار کسی شخص کو مُتصّف با خلاق فاضلہ کر سکتا ہے۔ اور یہ عجیب شانِ ایزدی ہے۔ کہ سرور کائنات علیہ الصلوٰۃ والسّلام سے جب کبھی خُلق عظیمہ کا اظہار ہؤا تو وہ ایسے ہی وقت ہؤا جب اس خلق کے دبا دینے کے لئے ہر طرف سے اسباب بکثرت موجود تھے ۔

اب ہم درجہ بدرجہ اُن تمام اخلاق فاضلہ اور اعمالِ حسنہ کا ذکر کرتے ہیں جنھوں نے حضرت نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسّلام کو

کُل انبیا وُمرسلینؑ سے ممتاز کر رکھا ہے۔ اور وہ خلق ہیں کہ جن کے نہ ہونے پر انسانی سوسائٹی کسی خیر و برکت کو اپنے اندر پیدا نہیں کرسکتی۔ یُوں تو کوئی بھی ایسا خلق نہیں جس کی ضرورت ہمیں نہ ہو کیونکہ میرے نزدیک تو اخلاق فاضلہ کی مجموعی حالت کا نام ہی انسانیت ہے لیکن ہم یہاں سب سے پہلے اُس **خلق محمدیؐ** کا ذکر کرتے ہیں جس کا ہونا جیسے کہ چھوٹے سے چھوٹے اِنسان کے لئے ضروری ہے۔ ویسے ہی ایک بڑے سے بڑے انسان کے لئے بھی لازمی ہے۔ بلکہ وہ خُلق تو کچھ اِس قسم کا ضروری خُلق ہے کہ اُس کے سوا کوئی آدمی بھی عظمت اور کامیابی کا مُنہ دیکھ نہیں سکتا۔ ہر امر میں کامیابی اُسی ایک خُلق سے وابستہ ہے۔ مشکلات کا سامنا اُسی کے طفیل آسان ہو جاتا ہے۔ اس خلق سے میری مراد **استقامت** ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ جب ایک مہتم بالشان امر حقّہ پر کوئی کھڑا ہو جائے تو اس کے لئے ہر ایک مصیبت ہر ایک تکلیف اُٹھانے کو وہ طیار ہو جائے۔ اس کے حصول اور قیام کے لئے اگر اس کے مفاد۔ اُس کا مال۔ اُس کی عزت۔ اُس کے ثمرات اُس کی جان نہ صرف معرض

خطرہ میں ہی پڑنے والی ہو۔ بلکہ اگر فی الواقعہ اُن سب میں اُسے نقصان بھی ہوتا ہو تو بھی اُس نقصان کی پروا نہ کرے۔ ایسا ہی اس امرِ حقّہ کے چھوڑنے کے لئے اگر اُس کے مخالفین اسے ایسے امور کی تحریص دلائیں جن کی اُسے سخت احتیاج تو ہو مگر وہ اپنی احتیاج کے پورا ہونے کو اس امرِ حقّہ کی خاطر قربان کر دے۔ اور جس چیز کی اُسے تحریص دلائی گئی ہو اُسے نفرت کے ساتھ رد کر دے لیکن اُس امرِ حقّہ کو نہ چھوڑے ✣

حقیقی استقامت صرف استقلال کا ہی نام نہیں بلکہ اس کے ایک خُلق میں عقدِ ہمّت عزم سیر چشمی قناعت۔ ایثار۔ شجاعت بُردباری تحمّل صبر اور بہت سے دیگر اُمور شامل ہیں یعنے جب تک یہ سب کے سب اخلاق کسی انسان میں موجود نہ ہوں اس میں استقامت کا جوہر پیدا نہیں ہو سکتا ✣

استقامت ایک ایسی عظیم الشان طاقت ہے۔ کہ اُس کے ساتھ کُل دُنیا آسانی سے فتح ہو سکتی ہے۔ صُوفیائے کرام نے اِس کا نام فوقُ الکرامت رکھا ہے۔ استقامت وہ کام کر سکتی ہے۔ کہ جو

ایک معجزہ اور کرامت کے ذریعہ نہیں ہوسکتا۔ قرآن کریم نے تو
نزولِ ملائکہ کا مورد بھی اُسی جوانمرد انسان کو قرار دیا ہے جو راہِ حق
میں کامل وفا اور **اِستقامت** دکھلا سکتا ہے۔ ایک شخص کی
راہ میں جس قدر مشکلات کا سامنا ہو اُسی قدر اُس کے جوہر کھُلنے
کا وقت آتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے۔ کہ اس خُلق کا مظہرِ اتم نبی کریم
علیہ الف الف صلوٰۃ والسّلام کی ذات والا صفات تھی۔ کیونکہ
آپؐ کو ایک امرِ حقّہ کے قائم کرنے میں جن مشکلات کا سامنا پڑا
وہ کبھی اور مصلح ریفارمر یا کسی رکھی منی کے راہ میں پیدا نہیں ہوئے +

آپؐ نے دُنیا کی اصلاح کا بیڑا ایک ایسے وقت اُٹھایا جبکہ
دُنیا پر سخت سیاہ کاری اور بدتہذیبی کی گھٹا چھائی ہوئی تھی تاریخ
اِس بات کی شاہد ہے۔ کہ ساتویں صدی عیسوی کا زمانہ بداخلاقی
اور بدکرداری کے لحاظ سے دُنیا کی تاریخ میں ایک بدترین زمانہ تھا۔
ہند۔ ایران۔ شام۔ مصر۔ یونان۔ یورپ الغرض معلومہ دُنیا کا ہر ایک
گوشہ شرارت اور جہالت کا مامن و ملجا تھا۔ اگرچہ اس وقت
ہر ایک مُلک کی ظلمانی حالت ایک نُور کو چاہتی تھی۔ اور اسی لئے

آپؐ کا مشن کُل دُنیا کی طرف تھا کیونکہ دُنیا کا ہر ایک حصّہ محتاج اصلاح تھا لیکن حکمت بالغہ نے آپؐ کا ظہور اس مُلک میں کیا جو اس وقت کُل دُنیا کے مقابل سیہ کاری اور بدکاری کا مرکز بن رہا تھا۔

اہل عرب کو نہ کسی کی شرم تھی نہ حیا۔ وہ اپنی بدکرداریوں پر فخر و ناز کرتے۔ خُون بہانا قتل مقاتلہ۔ دُختر کشی۔ ڈکیتی۔ زنا۔ قمار بازی شراب خواری۔ غرض کونسا قبیح سے قبیح گُناہ اور کونسی رذیل سے رذیل بداخلاقی تھی جو بدرجۂ اتم عرب میں موجُود نہ تھی۔ اور ان سب بدکرداریوں کی جڑھ یعنی بُت پرستی تو اُس حدتک پہنچ چُکی تھی کہ توریت والے عربوں کی بُت پرستی مثال کے طور پر بیان کیا کرتے تھے۔ تہذیب کی چھوٹی موٹی لہریں کسی نہ کسی وقت دُنیا کے دیگر ممالک میں موج زن ہوچُکی تھیں لیکن عرب تھے جو اس وقت تک ہر قسم کی تہذیب سے بالکُل کورے تھے۔ وہ خانہ کعبہ جسے قوموں کے باپ ابراہیم علیہ السّلام نے خدائے واحد کی پرستش کیلئے تعمیر کیا اور جس کے لئے دُعا کی کہ وہ بُتوں سے آزاد رہے۔ وہی خانہ کعبہ

بڑے بڑے بُتوں کے علاوہ سال کے تین سو ساٹھ ۳۶۰ دنوں کے لحاظ
سے تین سو ساٹھ بُت کا معبد بن رہا تھا۔ اُس ظُلمت وجہالت سے
جس نے آنحضرت صلعم کی قوم کو گھیرا ہُوا تھا آپؐ تنگدل ہوئے
آپؐ نے دُنیا کے چار گوشوں پر نگاہ ڈالی آپؐ کو ہر طرف ظلمت ہی
ظُلمت نظر آئی۔ آپؐ گھبرائے آپؐ خُدائے قُدّوس کی جناب میں چلّائے
حق کی تلاش میں آپؐ مصداق آیۂ کریمہ ووجدك ضالًّا فھدٰی
سرگشتہ ودیوانہ ہوئے۔ آخر ہادئی حقیقی نے آپؐ کو نہ صرف
نُورِ حقّانیت کا ہی پتہ دیا بلکہ اُس نُور کے پھیلانے کے لئے بھی
آپؐ کو ہی مامور کیا۔ آپؐ نے کمرِ ہمّت باندھی اور اپنی قوم
میں حق کی تبلیغ شروع کی +

مسئلۂ ارتقاء یعنے تھیوُری اوف ایوولیوشن کے دلدادوں کے
لئے یہ امر واقعی غور طلب ہے۔ کہ جب اُن کے نزدیک دُنیا کی رفتارِ
ترقّی میں ہر ایک نیا مرحلہ موجُودہ حالات میں سے ہی پیدا ہُوا کرتا ہے
اور نئی تحریکیں علے العمُوم اُنھیں خیالات کا عکس ہُوا کرتی ہیں جو
پہلے سے چاروں طرف مستعد طبائع میں پیدا ہو چُکی ہوں۔ تو

ساتویں صدی عیسوی کا وہ تاریک زمانہ جس نے ہر طرف فطرت اِنسانی کو پستی کی تہ میں پہنچا دیا تھا۔ وہ عرب جیسے تاریک ترین سرزمین میں کمال اِنسانی کی معراج پر پرواز کرنے والی فطرت کس طرح پیدا کر سکتا تھا؟

اس عقیدے کے ماننے والے یہ رائے رکھتے ہیں۔ کہ زمانہ میں جس وقت کوئی تبدیلیٔ خیالات یا انقلاب آراء یا کوئی اصلاح ہونے لگتی ہے۔ تو یہ کسی خاص وقت کا یا کسی خاص ایک دماغ کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس نئی تحریک کے مناسب حال طبائع پہلے سے ہی طیّار ہو جاتی ہیں۔ مختلف اسباب صدیوں آہستہ آہستہ کام کرتے آتے ہیں۔ علم وفن کی ترقّیات معلُومات کی وسعت قدیمہ مروجہ خیالات کے نقص اپنی اپنی جگہ کام کر کے لوگوں میں ایک قسم کا انتشار اور ہیجان پیدا کئے ہوئے ہوتے ہیں طبائع میں اِضطراراً اسی ایک امر کی طرف میلان ہوتا ہے۔ دِلوں میں اس مقصود کے حصول کے لئے ایک مجہُول الکُنہ طریق پر اُمنگیں جوش مارتی ہیں۔ الغرض چاروں طرف خیالات میں ایک قسم کی طیّاری ہو جاتی ہے۔ ایسے

وقت میں کوئی حکیم مزاج لیکن دل کا جری انسان پیدا ہوکران خیالات کو ایک مرئی قالب میں ڈھال دیتا ہے۔ وہ باتیں جو لوگوں کے دلوں میں اندر ہی اندر پک رہی ہوتی ہیں۔ وہ اُنھیں الفاظ کا لباس پہنا کر زمانہ کی بالقُوہ استعدادوں کو بالفعل کر دیتا ہے۔ ایسے شخص کو اگر دوسروں پر فوقیّت ہو سکتی ہے تو صرف اس ایک بات میں کہ اُس میں ان اُمور کے اظہار کی قابلیّت اور جُرأت ہوتی ہے جو طبائع میں پہلے سے ہی مرکُوز ہوتی ہیں۔ لوگ اُس کی مضبُوطی دلائل کے آگے سر نہیں جُھکاتے بلکہ اُس کے دلائل میں وہ اپنے نصب العین کو دیکھ کر اُنھیں فی الفور قبُول کر لیتے ہیں۔ لاریب یہ باتیں جو قائلینِ مسئلۂ ارتقاء پیش کرتے ہیں معقُولیّت سے باہر نہیں۔ بلکہ واقعاتِ عالم اُن کے موٴیّد ہیں۔ چنانچہ عیسوی کلیسا کے مصلحین یعنی لُوتھر اور کالوِن کے حالات اِسی مسئلۂ ارتقاء کے ماتحت آجاتے ہیں۔ پندرھویں صدی عیسوی میں یونانی علوم کی ترویج وغیرہ ایسا ہی دیگر فنون کی ترقّیات نے ایک طرف۔ اور خانقاہ نشین پادریوں کے برخلاف روزافزوں نفرت نے

دوسری طرف بانیانِ ریفارمیشن (اصلاحِ کلیسیہ) کے پیدا ہونے سے پہلے اُن کی سڑک صاف کر رکھی تھی۔ لوگ پہلے سے ہی اس بات کے لئے طیار رہتے تھے جو اُن بزرگوں نے تعلیم کی۔ یہی حال ہم سوامی **دیانند** جی مہاراج کا دیکھتے ہیں۔ اُنھوں نے بھی زمانہ کی نبض شناسی میں غلطی نہیں کی اور اصلاحِ مُلک کے لئے وہ نسخہ طیّار کیا کہ جس کی قبولیّت کے لئے طبیعتیں مختلف اسباب کے ماتحت پہلے سے طیار ہو چکی تھیں۔ اصلاح کا جو راستہ اُنھوں نے تجویز کیا اُس پر ملک کے تعلیم یافتوں کا ایک حصّہ پہلے سے قدم مار رہا تھا۔ آفتابِ اسلام کی تیز شعاعوں نے ایک طرف اور جدیدہ علُوم کی روشنی نے دوسری طرف شرک کے اندھیرے کو مٹانا شروع کر دیا ہُوا تھا بت پرستی سے نفرت اور پُرانک تعلیم سے وحشت پیدا ہو رہی تھی۔ برہمنوں کے خانہ ساز اصُولوں سے طبیعتیں رُکی جا رہی تھیں۔ توحید کے عشّاق تو اسلامی جامہ پہن رہے تھے۔ لیکن وہ جو ابھی تذبذب میں تھے یعنی ایک طرف قدیمی شرک کے اثروں سے پورے باہر بھی نہ تھے اور دوسری طرف توحید نے اپنا دُھندلا سا نقش

اُن کے لوح دل پر ابھی جمانا شروع کیا تھا اُنھوں نے توحید کی اس نئی مگرم کا ذب اشتہا کو عیسائیت کی توحید فے التثلیث سے تسکین دی۔ پھر ایک لاتعداد جماعت نے **وید** چھوڑ کر وحدہٗ لاشریک **براھمہ** کے لئے **براھمو مندر** بنائے جن میں سے بُتوں کو قطعاً نکال دیا گیا۔ مگر عام طور پر لوگوں کا آبائی مذہب جلدی چھوڑ دینا یا قومی عقائد کو ترک کر کے اپنے عزیزوں سے الگ ہو جانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا۔ یہ امر تو ایسی بھاری قُربانی چاہتا ہے کہ جس کے لئے مُدّتِ مدید کی طیّاری درکار ہوتی ہے۔ اِسلئے ایسے انقلاب کے وقت اِنسانوں میں ایک قسم کی حرکت مذبُوحی پیدا ہو جاتی ہے۔ نئے خیالات کی دلفریبی اور پُرانے تعلّقات سے دلبستگی ایک درمیانی راستہ تجویز کر لیتی ہے۔ انسان ایسے وقت نئی صُورتوں کو اُسی اپنے پُرانے لباس میں دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ چاہتا ہے اور کوشش کرتا ہے کہ جو نئی باتیں اُسے پسند آگئیں وہ ہو نہ ہو اس کی آبائی تعلیمات میں سے نکل پڑیں۔ اور وہ امُور جن سے وہ مُتنفّر ہو چکا ہے وہ کسی نہ کسی طریق سے پُرانے اصلی

عقائد پر الحاق شُدہ ثابت ہو جائیں +

توحید کی صداقت جو اسلام ہندوستان میں لایا بُت پرستی کی بنیاد ہلا چکی تھی۔ لیکن، آبائی تعلّقات قبُولیّتِ اسلام کے مانع تھے۔ اسلئے مذکورہ بالا قدامت پرست طبائع نے چاہا کہ تعلّقاتِ قدیمہ کے قیام کے ساتھ ساتھ جدید باتیں اختیار کی جائیں۔ براھمہ سماج بھی دراصل اُس اِنسانی کمزوری کا ایک نتیجہ تھا۔ لیکن براھمہ سماج کا وید کو چھوڑ دینا اُس کی اشاعتِ عامہ کی راہ میں روک تھا۔ وید کے پرستار راجہ رام موہن رائے کی بجائے کسی ایسے مہا پُرش کو قبُول کرنے کی طیّاری کر رہے تھے جو وید کو بھی قائم رکھے اور عناصر پرستی بُت پرستی اور دیگر شرک کی صورتوں کو بھی خارج از وید ثابت کر دکھلائے۔ شرادھ وغیرہ کو بدعات اور ذات پات کے امتیاز کو برہمنوں کی مخترعات، بتلائے۔ اس ضرورت کو سوامی دیانند جی نے پُورا کیا۔ اس نے اُسی امر کا پرچار کیا کہ جس کی پیاس اسلامی روشنی نے تعلیم جدید کے، ساتھ ملکر ہندو اصحاب کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھی۔ اسی لئے نئی تعلیم یافتہ جماعت نے ہی سب سے اول سوامی جی کو خوش آمدید

کہا سوامی نے نہ صرف توحید کو مغزِ وید ثابت کرنا چاہا۔ بلکہ اُس نے ہر ایک موجودہ ترقّی کی اصل شکل وید کے الفاظ میں دکھلانے کا ادّعا کیا۔ اس نے ہَوَن کے دُھوئیں میں جو اگنی کی پرستش میں کیا جاتا ہے موجودہ انجنوں کی سٹیم اور اندر کے ہَوائی گُرّہ والی سواری میں بیلون دیکھے۔ زمین کی تہ یعنے پاتال میں اُسے امریکہ نظر آیا۔ اور بندروں کی بستی میں اُسے یُورپ دکھلائی دیا۔ الغرض اس مہا پنڈت نے ملک کی نبض شناسی کر کے انھیں خیالات کو الفاظ کے قالب میں ڈھال دیا جو تعلیم یافتہ طبائع میں چاروں طرف موج زن ہو رہے تھے۔ لہٰذا ایسے واقعات پر مسئلہ ایوولیوشن کے دلدادوں کا یہ کہ دینا بالکل بجا ہے کہ لوتھر اور کالون کا وُجود یُورپ میں اور دیانند جی کی شخصیّت ہندوستان میں ارتقاء کے ہاتھ کا ایک کامل کرشمہ ہے۔ اسی طرح دنیا کے دیگر انقلابات بھی اسی مسئلہ کی تائید میں زبردست شہادتیں ہو سکتی ہیں۔ مگر مسئلہ ارتقاء کے ایک قاعدہ عام ہونے میں اگر زمانہ کی تاریخ نے استثنائیں بھی پیدا کی ہیں۔ تو یہ استثنائیں

اُن انقلابات میں پائی گئی ہیں جو انبیاءؑ کے وجود نے وقتاً فوقتاً دُنیا میں پیدا کی ہیں۔ اور جس کی کامل تشریح حضرت خاتم النّبیین علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی میں نظر آتی ہے *

اس امر کے متعلق اس جگہ میں صرف اس ایک اصلاح کا ذکر کرونگا جو آنحضرت صلعم نے بُت پرستی کے متعلّق عرب سے شروع کی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا یہ تحریک جو آپؐ کے دل میں پیدا ہوئی وہ ہمعصروں کے خیالات کا عکس تھا یا وہ زمانہ مُطلق اس امر کیلئے طیّار نہیں تھا۔ یہ امر مُسلّم ہے کہ اس وقت توحید پر کامل موت وارد ہوچُکی تھی ہندوستان۔ ایران۔ شام۔ فرنگستان۔ بت پرستی۔ عناصر پرستی۔ اجرام پرستی اور سب سے آخر انسان پرستی کے غلام ہو رہے تھے۔ عزت اور حرمت کے بلند سے بلند مقام پر بُتوں کا تخت گاہ تھا۔ اس وقت بھی دُنیا سے وہ لٹریچر معدُوم نہیں ہُوا جو ہندوستان۔ ایران اور فرنگستان نے اُس وقت پیدا کیا تھا۔ اُن سب کی سب کتب میں علے العموم ہم اس آتش معرفت کی ہلکی سے ہلکی چنگاری تک بھی نہیں دیکھتے کہ جس نے عنقریب

فاران سے نکل کر جنگل شرک کے بھسم کر دینے تھے۔ پھر ہم کیسے مان لیں کہ وہ توحید جسے شارعِ اسلام علیہ السّلام نے ازسرِ نو دُنیا میں زندہ کیا وہ پنجۂ ارتقاء کی قلمکاری تھی۔ اس موقعہ پر آپؐ کی دس گیارہ سالہ زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد آگیا ہے جو شاید اس مُعاملہ زیرِ بحث پر کافی روشنی ڈالدے۔ آپؐ اس بچپن کی عمر میں ابو طالب اپنے چچا کے ہمراہ سفر شام کو جا رہے تھے راستہ میں ایک راہب کے ہاں قیام ہُوا۔ اثنائے گفتگو میں عرب کے عظیم الشّان اور نہایت ہی مُقتدر دو بُتوں یعنی لات اور ہُبل کا ذکر آگیا۔ اُس پر آپؐ نے بیساختہ فرمایا۔ کہ جس قدر نفرت اور عداوت قلبی مجھے لات و ہُبل سے ہے وہ کسی اَور چیز سے نہیں +

اللہ اللہ وہ زمانہ جس میں کُل دُنیا بُتوں کی مہما کر رہی ہو۔ عرب کے گرد و نواح کے ممالک سب بُتوں کے تسلّط میں ہوں۔ وہ تعلیمات قدیمہ جو بُت پرستی کے خلاف کبھی نازل ہوئیں تھیں عرب اُن کے دائرہ اثر سے ہمیشہ باہر رہا ہو بلکہ وہ تعلیمیں اپنی اپنی جگہ بذاتِ خود متروک و مرْدود ہو چکی ہوں۔ پھر اہلِ عرب کے نزدیک لات و ہبل کُل دنیا کے

بُتوں کی ناک سمجھے گئے ہوں اور خدا کے ہاتھ میں پرورش پانے والا بچہؐ
اُس خاندان سے ہو کہ جس کی شرافت اور عزّت اُسی لات وہبل
کے گھر کی تولیت سے ہو۔ اُس کی نو آموز آنکھ اور کان نے ہمیشہ اُسی
لات وہُبل کی تعظیم وتکریم ہی دیکھی اور سُنی ہو۔ اُس کی قوم وملک کی
ہر مشکل کُشائی اُسی لات وہبل کے ہاتھ سے سمجھی گئی ہو۔ جس کُرّہ
ہوا میں اُس معصوم بچہؐ کا ابتدائی اُٹھان ہُوا ہو وہ لات وہُبل کی
عظمت ومحبّت سے معمُور ہو۔

الغرض اُس سلیم الفطرت بچہؐ کے گرد وپیش ایسے ہی سامان ہوں
کہ جس سے اُس کے دل میں لات وہُبل کی عظمت وعزّت اور محبّت جم سکے
لیکن جُوں ہی ان دونوں کا نام اس کے سامنے لیا جاوے وہ اُن کے
پرستاروں کی ذرا سی پرواہ نہ کرکے اپنی نفرت وحقارت کا اظہار کرے
اور آیندہ کے واقعات یہ ثابت کردیں کہ یہ نفرت وعداوت فی الواقعہ
اُس کی پاک فطرت میں گڑی ہوئی تھی۔ اب کیا یہ نفرت وعداوت
اُسے ورثہ میں یا خُون کے ذریعہ ملی۔ اُس کے آبا واجداد تو اُن بُتوں
کی محبّت وعشق میں سرشار تھے۔ بلکہ وہ خطرناک مخالفت جو بعد میں اُس کے

عزیز و اقارب نے لات وہبل وغیرہ کی حمایت میں اُس کی کی وہ اس بات کا کامل ثبوت ہے۔ کہ آنحضرت صلعم کی زندگی مسئلۂ ارتقاء کی بُوالعجبیاں اپنے ساتھ لئے ہوئے نہ تھی۔ اگر آپؐ کی تعلیم ایوولیوشن کا نتیجہ ہوتی تو پھر آپؐ کا بُت پرستی کے خلاف کھڑا ہونا تو دراصل اُنھیں خیالات کا اظہار ہوتا جو اُس کے معاصرین کے دلوں میں پیدا ہو چکے تھے۔ لیکن عرب نے جو خطرناک مخالفت آپؐ کی کی! اور پھر بتوں کے خلاف آپؐ کی تیرہ سالہ جانکاہ کوششوں کا نتیجہ یہ ہُوا کہ صرف معدودے چند ہی آدمی آنحضرتؐ کے ساتھ ہوئے۔ یہ اس بات کا کافی ثبُوت ہے۔ کہ یہ تحریک جو آنحضرتؐ کے دل میں ہوئی وہ نواحی خیالات کا عکس نہ تھی بلکہ وہ آسمانی تحریک تھی +

اس میں شک نہیں کہ آنحضرت صلعم کی بعثت سے چند ہی برس پہلے سرزمین عرب میں دو تین اور شخص بھی بُت پرستی سے متنفر نظر آتے ہیں۔ لیکن اُن کی ہستی سے آپؐ کی شخصیّت کا ارتقائی طریق پر پیدا شدہ تسلیم کرنا اس مسئلہ کے ضروری لوازمات کو نظر انداز کرنا ہے۔ ارتقائی رفتار ہمیشہ تدریج اور آہستگی کو چاہتی ہے۔ اس کے ماتحت عالم کی

کا یا پلٹنے والی کسی نئی اصلاح کے وُجود میں آجانے کے لئے تیس چالیس کیا پچاس برس بھی حقیقت نہیں رکھتے۔ واقعاتِ عالم اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ کسی خاص قسم کے خیالات یا آرائے کا قائم ہو جانا اور پھر اُنکے متضاد خیالات یا آرائے کا دنیا سے مٹ جانا ایک لمبے عرصہ اور پُشتہا پشت کی مُتواتر کوششوں کو چاہتا ہے۔ اوّل اوّل کسی خاص تحریک سے ایک نیا خیال دُھندلی شکل میں بیج کے طور پر کسی طبیعت میں پیدا ہو جاتا ہے۔ جس پر اور صدہا ملتے جلتے واقعات آبیاری کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر صدیوں بعد وہ خیال دن بدن مضبوط ہوتے ہوتے اور مُتضاد خیال کو روز بروز کمزور کرتے کرتے کسی زبردست ہاتھ سے مشہود و مرئی شکل اختیار کر کے طبائع عالم پر بتدریج غالب آجاتا ہے۔ چُنانچہ دُنیا نے کوئی انقلابی تحریک ایسی نہیں دیکھی جس نے ارتقائی طور پر تو پیدائش حاصل کی ہو اور پیدائش سے پہلے صدیوں تک مادرِ گیتی کے حمل میں نہ رہی ہو الغرض یہ ارتقاء کے کارناموں کا تمیزی نشان یہ ہوتا ہے۔ کہ جس بات نے اُس کے ماتحت پیدا ہو کر آخر کار دُنیا میں زبردست

انقلاب پیدا کر دینا ہوتا ہے وہ صدیوں پہلے پیدا ہو کر ایک طرف آہستہ آہستہ اپنا سکہ طبائع عالم پر جماتی جاتی ہے۔ اور دوسری طرف اس امر کو کمزور کرتی جاتی ہے کہ جس کی بیخکنی اس نئے امر سے منصور ہوتی ہے۔ جن واقعات نے لوتھر اور کالون جیسے مصلحین فرنگستان میں پیدا کر دیئے۔ ان کا آغاز اگرچہ فتح قسطنطنیہ سے ماناگیا۔ لیکن میری تحقیق میں اس کا اصلی سبب فتح قسطنطنیہ سے کئی صدیاں پہلے دُنیا میں پیدا ہو چکا تھا۔ فتح قسطنطنیہ نے جن رومی اور یُونانی مُقفّل علوم کو یُورپ میں پہنچایا وہ اس قدیمی خیال کے موّیدات تھے +

اصل اصول ریفارمیشن (اصلاح کلیسیہ) کا یہ تھا۔ کہ امور دینیّہ میں کسی خاص شخص کی رائے یا اجتہاد کی پرواہ کی جائے۔ بلکہ ہر شخص کی رائے پر کلامِ الٰہی کو ترجیح دی جائے۔ رومن کیتھلک کلیسیہ پوپ کو پطرس کا جانشین قرار دے کر اس کے اجتہاد اور احکام پر چلنا عیسائیّت کا اصل اصُول قرار دیتا تھا۔ اور اس بات کی سخت ممانعت کرتا تھا کہ کتب مُقدّسہ کے معانی اور مطالب سے کوئی اور شخص

واقف ہو۔ اس کے مقابل لُوتھر اور کالون نے ہر انسانی اجتہاد پر
کلامِ الٰہی کو ترجیح دینے کے لئے تراجم اناجیل پر اور اس کے مطالب
کو عام فہم کرنے پر زور دیا۔ اب امر تحقیق طلب یہ ہے کہ یہ خیال کہ امُورِ ملّیہ
میں ہر امر متنازعہ پر شخصی اجتہاد کے مقابل کلامِ الٰہی کو ترجیح دی جائے
یورپ میں کہاں سے پیدا ہؤا۔ اُس کو تجدید و ترویجِ علُوم یونانی و روما کی طرف
منسُوب کرنا اُسی صورت میں درست ہوسکتا ہے جب اُس لٹریچر میں
یہ اصول کسی نہ کسی رنگ میں پایا جائے لیکن یہ امر مُسلّم ہے کہ یُونانی و رومی
علم ادب زیادہ تر انھیں کے فہم و دماغ کا نتیجہ ہے۔ کہ جن کے سامنے
یہ سوال کبھی پیدا نہیں ہؤا۔ وہ تو بُت پرست مشرک اقوام سے تھے
انھیں الٰہیات سے کوئی تعلّق نہ تھا معقُولات کے بیشک وہ بادشاہ
تھے لیکن حق اللہ اور حق العباد کے معاملات ان کی نگاہ سے بہت ارفع
تھے۔ اسلیے امر زیرِ بحث کو ان کی طرف منسوب کرنا ایک بھاری مورخانہ
غلطی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ ان یونانی رومی حکماء کے طریق استدلال
نے علمی تحقیق کا ذوق سلیم یُورپین دماغ میں پیدا کر کے اہل یورپ کو
پوپ کی غاصبانہ حکومت سے آہستہ آہستہ متنفر کردیا۔ اور دیگر

معاملاتِ دُنیوی کی طرح اُمورِ مذہب میں بھی پوپ کے جوئے کے نیچے گردن رکھنے کی بجائے ہر ایک اہل الرّائے کو خُود غور و فکر کرنے کا شوق پیدا ہُوا۔ لیکن اس کا نتیجہ تو یہ ہونا چاہیئے تھا کہ شخصی اجتہاد کا دائرہ وسیع ہو جاتا اور پوپ کے ماسوا اَوروں کو بھی معاملاتِ ملّیہ میں رائے زنی کا حق ہو جاتا۔ نہ یہ کہ کلامِ الٰہی کی تلاش اور تجسّس ان معاملات میں پیدا ہوتی اور ہر مسئلہ میں کلامِ الٰہی کے الفاظ کو انسانی الفاظ پر ترجیح دیجاتی۔ یورپ کے مذہبی علمِ کلام میں یہ ایک نیا امر تھا اور اُس کی اصل کو یونانی رُومی حُکما کی تحریر میں تلاش کرنا ایک بے سُود کوشش ہے ہم کیوں اس کو تجدید علوم یونانیہ کا ایک اِتّفاقی نتیجہ قرار دیں جس صورت میں یہ اصُول انھیں الفاظ میں ہمیں اسلام کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے۔ قرآن نے ہی کل کُتب مُقدّسہ میں سے سب سے اوّل الٰہیات کے اس زرّین اصُول کو قائم کر کے کتاب اللہ کے احکام اور منشا کے آگے ہر انسانی اجتہاد کی گردن جُھکا دی۔ اس اصُول نے اُندلس کی راہ سے یورپ میں اپنا راستہ پیدا کیا۔ اور اِس اسلامی عقیدہ نے آخر کار پوپ کے کالوحی احکام و اجتہاد پر

الفاظ اناجیل اور ملفوظات مسیح کو ترجیح دینے کا خیال پیدا کر کے لوتھر جیسے دلوں میں لوتھر سے بھی پہلے مطالعۂ انجیل اور ترجمۂ انجیل کی طرف طبائع کو پھیر دیا۔ چنانچہ لوتھر کی اس تعلیم نے کہ الفاظ انجیل کو پوپ کے اجتہاد و احکام پر ترجیح ہونی چاہئے۔ لوتھر کو کلیسیہ روما کے پادریوں سے **محمدی کُتّا** کہلوایا۔ کیونکہ کلیسیہ مذکور کے علم و یقین میں **لوتھر** کا یہ طریق عمل محمدی تعلیم فردوا الی اللہ والرسول سے اخذ شدہ تھا۔ یعنی امور متنازعہ میں تم کل انسانی اجتہادوں کو چھوڑ کر خدا اور اس کے رسول کے کلام کی طرف رجوع کرو۔ الغرض جن خیالات نے لوتھر کو پیدا کر کے اس کے سر پر مقبولیت عامہ کا تاج پہنایا۔ وہ لوتھر سے صدی پہلے نہیں بلکہ کئی صدیوں پہلے اسلام سے یورپ میں آئے۔ ہاں تجدید علوم یونانیہ نے اس خیال کی آبیاری کی۔ اور بالمقابل پوپ کی عظمت بھی ساتھ ہی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی۔ اسی طرح ہندوستان میں بھی توحید کا بیج اسلام نے بویا اور پھر آہستہ آہستہ یہ درخت بارآور ہوتا گیا۔ دن بدن ایک طرف توحید زور پکڑتی گئی اور بت پرستی بالمقابل کمزور

ہوتی گئی۔ راجہ رام موہن رائے اور کیشب چندرسین اس عمارتِ توحید کی تعمیر کے مزدور تھے۔ اور اسی کام کو کرنے والا سوامی دیانند تھا۔ الغرض مسئلہ ارتقاء کے پرستاروں کو یہ ماننا پڑتا ہے کہ جس طرح اصلاح کُن اُمور ایک مُدّت پہلے طبائع میں بیج کی طرح پیدا ہوکر آہستہ آہستہ اپنے کامل ظہور کی طرف قدم مارتے ہیں اور دن بدن ترقّی کی شکل اختیار کرتے جاتے ہیں۔ اُسی طرح اصلاح طلب اُمور کی طرف سے طبیعتیں دِن بدن متنفّر ہوتی جاتی ہیں۔ گویا یہ دو مُتضاد اُمور بالمقابل معکُوس رفتار چل کر آخر کار قطعیّت پر بتدریج آجاتے ہیں لیکن صاحب الصلوٰۃ والتحیّاۃ کی تحریکِ توحید ان لوازماتِ ارتقاء سے بالکُل جُدا ہے نہ آپؐ کی بعثت سے پہلے **عرب** میں یا دُنیا میں بُت پرستی کے خلاف کوئی خاص تحریک پیدا ہوکر آپؐ کی پیدائش تک مضبُوط ہوتی گئی۔ نہ توحید کی حمایت میں کوئی خاص خیالات بتدریج ترقّی کرتے گئے۔ آنحضرت صلعم کی اصلاح تو اُس صُورت میں ارتقاء کے ماتحت آسکتی ہے۔ جب یہ امر ثابت ہو جاوے کہ وہ توحید جو جناب موسٰیؑ یا جناب مسیحؑ نے تعلیم کی۔ یا جو بخیال آریہ سماج

وید میں پائی جاتی تھی وہ تاریخ الہام سے دن بدن مضبوط ہوتی گئی۔ اور اس کے مقابل شرک روز بروز کمزور ہوتا گیا ہو لیکن معاملہ بالکل دگرگوں نظر آتا ہے۔ ہم کو تو تاریخ میں یہ پتہ لگتا ہے۔ کہ اگرچہ مختلف مرسلین علیہم السّلام نے توحید کا سبق دیا لیکن دُنیا نے اُسے بہت جلد بُھلا دیا اور جُوں جُوں اسلام کی پیدائش کے دن قریب آتے گئے شرک اپنا کامل تسلّط دُنیا پر بڑھاتا گیا حتٰے کہ نبی کریمؐ کی بعثت پر چاروں طرف شرک ہی شرک نظر آتا تھا بعثت نبوی سے سات صدی پہلے جناب مسیحؑ نے ایک حصّہِ دُنیا کو شرک کی نجاست سے پاک کرنا چاہا۔ لیکن جُوں ہی توحید کی یہ ندی یُونان و روما کے راستے یورپ کے بحرِ شرک میں داخل ہوئی اُسی وقت اس ندی کا اس طرح نام و نشان مٹ گیا جس طرح بڑے سے بڑے دریا کا سمندر میں داخل ہو کر مٹ جاتا ہے۔ مسیحؑ کے بعد ایک آدھ صدی تک تو عیسائیوں میں موحدین نظر آتے رہے لیکن آخر کار یُونانی اور رومی مشرکانہ خیالات نے عیسائیت کو اپنے رنگ میں رنگین کر دیا۔ جیوپٹر اور ذی اوس کے پرستاروں نے

بہ تبدیلئ نام و مقام پُرانی بُت پرستی کو نئے قالب میں ڈھال دیا جیوپیٹر کے تخت پر یسوع اور دینس کی کُرسی پر مریم کو متمکن کیا۔ اور ان کے ماتحت جو جو دیوی دیوتا رومن اور یونانی مائتھولوجی میں مختلف جذبات و اشغال انسانی کی سرپرستی کے لئے پُوجے جاتے تھے۔ اُن کی جگہ کیتھلک کلیسیہ میں مختلف سینٹوں کو جگہ دی گئی۔ الغرض تمام کی تمام پُرانی مائتھیالوجی (مذہبی افسانہ جات) نے عیسائی لباس میں از سر نو ظہور کیا۔ گبن کا یہ مقولہ نہایت ہی نتیجہ خیز ہے۔ کہ یورپ نے مسیح کو بہت جلد اس لئے قبول کیا کہ مشرک یورپ نے از سر نو اُس خدا کو انسانوں میں چلتے پھرتے دیکھا کہ جس کی بابت اُنکے افسانے مملو تھے۔ وہ سُنتے آتے تھے۔ کہ کس طرح قدیم سے قدیم زمانوں میں خدا جیوپیٹر اور ذی اوس کے نام پر انسانی سوسائٹی میں جلوہ افروز تھا۔ کس طرح وہ انسانوں کے ساتھ ملتا جُلتا اور اُن کے معاملات میں دخل دیتا تھا۔ اُن کی نگاہیں طبعاً الیڈ[۱] اور اڈوسی[۲] کے زمانہ کو از سر نو دیکھنا چاہتی تھیں۔ اسلئے اُنھوں نے مسیح کے حالات کو سُن کر اُس قدیمی جیوپیٹر اور ذی اوس

نوٹ [۱و۲] یہ دو یونانی رزمیہ کتابیں ہیں جن میں مشرک یونانیوں کا خدا ہر ایک اہم انسانی معاملات میں دخل دیتا ظاہر کیا گیا ہے +

کو نئے لباس میں آسمان سے نازل ہوتے دیکھا۔ اور مسیح کو خُدائی رنگ میں قبول کر لیا۔ ان مشرکانہ تعلیم کا ذمہ وار بہت حد تک پولوس تھا جس نے اسرائیلیوں سے قطع کر کے یُونان میں مذہب کو ہر دلعزیز بنانے کے لئے یونانی خیالات میں عیسائیت کو رنگین کرنا چاہا۔ وہ **توحید** جسے مسیح لایا پھر مر گئی۔ اور اس طرح عیسائیت کی مشرکانہ شکل ہی مُشرک یورپ میں اس کی عظمت پھیلانے کا باعث ہوئی۔ الغرض جُوں جُوں آنحضرت صلعم کا زمانہ قریب ہوتا گیا توحید کا نقش دُھندلا اور شرک کا منظر بیّن اور روشن ہوتا گیا۔ یہی حالت ہم ہندوستان میں اور اس کے مضافات میں دیکھتے ہیں۔ وید کی توحید نے جس شرک کو مٹانا چاہا کچھ عرصہ بعد وہ خود اُس کا شکار ہو گئی۔ اگر وید والوں نے دریائے سندھ کو عبُور کر کے اصلی باشندگان ہندوستان کی زمین پر قبضہ پا لیا تو قدیمی معبُودوں نے وید والوں کے دلوں پر تسلّط پایا۔ چنانچہ ترتیبِ وید کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ ابتدائی رنگ کی توحید جو وید منتروں میں بیان کی جاتی ہے عناصر پرستی میں بدل گئی اور شرک نے ڈیرا آ لگایا۔ اگرچہ عارف بدھ

کی پیدائش نے پھر چند صدیاں رفتار شرک کو دھیما کر دیا لیکن آخر کار اُنھیں خونخوار معبُودوں نے جو ظہور وید سے پہلے اس ملک کے باشندگان پر حکمران تھے از سر نو دُرگا اور کالی وغیرہ کی شکل میں مُلک کا بہت سا حصّہ فتح کرنا شروع کر دیا۔ حتّٰے کہ بہت جلد وہ توحید کی دُھندلی روشنی جو کسی قدر وید کے ذریعہ ہند میں چمکی تھی فے الفور نابود ہو گئی۔ اور ظلمت شرک کی جہان میں اس قدر پھیل گئی۔ کہ چاروں طرف تاریکی ہی تاریکی نظر آنے لگی۔ دُنیا کا حال ایک تاریک ترین رات کی طرح ہو گیا۔ کہ جس کے خاتمہ پر آفتاب نے بصد آب و تاب جلوہ گر ہونا تھا۔ ایسی حالت میں اگر آفتاب اسلام کے طلُوع سے کچھ پہلے عرب میں توحید کی روشنی نے چمک دِکھلائی تو وہ اُس روشنی کی طرح تھی جو شب دیجور کے خاتمہ پر صبح کاذب کے رنگ میں مطلِع عالم پر پیدا ہو جاتی ہے لیکن جس طرح صبح کاذب کی روشنی ایک بے حقیقت چیز ہوتی ہے وہی حال اُن معدودے چند موحدین کا تھا جو آنحضرتؐ سے ایک نسل پہلے عرب میں پیدا ہوئے۔ یہ موحدین تو اُس آفتاب صداقت سے پہلے بطور ارہاص کے تھے۔ کہ جس نے عنقریب

نکل کر کُل دنیا کو مُنوّر کر دینا تھا۔ تھیوری آف ایولیوشن کے ماتحت تو چاہیئے تھا کہ بعثت نبوی سے مُدّتوں پہلے توحید مضبوط ہوتی جاتی اور شرک بالمقابل کمزور ہوتا جاتا اور یہ دونو امُور بالمقابل معکُوس رفتار پر چلکر قطعیّت کا رنگ نبی عربؐ کے ہاتھ سے دیکھ لیتے۔ لیکن معاملہ اِس کے برعکس ہے۔ لہذا بُت پرستی کی بیخکنی میں اسلامی تحریک کسی نہج پر بھی ارتقاء کا نتیجہ نہیں ہوسکتی۔ بُت پرستی کا عرب جیسے مُلک اور پھر خصُوصاً مکّہ سے دُور کر دینا کوئی آسان امر نہ تھا۔ یہ کام خُلقِ استقامت کا وہ اِنتہائی نکتہ کسی مُصلح میں چاہتا تھا۔ کہ جس کا اِظہار آنحضرت صلعم سے پہلے یا بعد میں تاریخ زمانہ کسی اور اُولوالعزم اِنسان میں نہیں دکھلاسکی۔ کوئی محبوب سے محبُوب اور عزیز سے عزیز چیز ہمیں نظر نہیں آتی جو آپؐ کو اور آپؐ کی اتّباع میں صحابہ کرامؓ کو اعلائے کلمتہ اللہ میں قُربان نہ کرنی پڑی ہو۔ در اصل جس قدر خطرناک مخالفت کسی مصلح کی راہ میں ہوتی ہے۔ اسی قدر وہاں استقامت کے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ مشکل تو یہ

تھی کہ بُت پرستی اہلِ مکّہ کو نہ صرف اِس لئے عزیز تھی کہ یہ اُن کا آبائی مذہب تھا بلکہ اِس لئے بھی کہ اہلِ مکّہ اور خصوصاً قبیلۂ قریش کی عزّت و وجاہت اُن کا رُعب اُن کی دولت و ثروت اُن کی وجہ معاش گویا اُن کی سب محبُوب ترین چیزیں اُن کے علم و یقین میں صرف ایک بُت پرستی کے قیام پر ہی قائم رہ سکتی تھیں بُتکدۂ کعبہ نے مکّہ کو عرب اور اُس کے نواحی ممالک کا مرجع بنا رکھا تھا ان نواحوں میں مکّہ ہی بڑی بھاری تجارت کی منڈی تھی قبیلۂ قریش کا رُعب اگر کُل عرب پر غالب تھا تو صرف اسی لئے کہ وہ بُتکدۂ کعبہ کے مُتولّی کاہن تھے۔ اس لئے جو شخص مکّہ کو بُتوں سے خالی کر کے مُلک سے بُت پرستی چھڑانا چاہتا تھا وہ نہ صرف اہلِ مکّہ کے جدّی مذہب پر ہی حملہ کرتا تھا بلکہ وہ اہل مکّہ کو ان کے وہم و گمان میں اُن کی دولت ثروت رُعب اور وجاہت سے محروم کرنیکی بھی فکر میں تھا۔ اُس کی بُہت ادنےٰ درجہ پر تشریح اُسی کوشش سے ہو سکتی ہے جب کو کوئی شخص پانڈوں کے مقابل ہردوار میں جا کر گنگا ماتا کی پرستش کے اُڑانے میں کرے۔ کیونکہ ہردوار کے

پانڈوں کی عزّت وجاہت اور معیشت بھی پرستش گنگا کے قیام پر منحصر ہے۔ حالانکہ اس وقت ہم اس سلطنت کے سایۂ رحمت میں پناہ گزین ہیں کہ جو ہماری جسمانی حفاظت کی ذمہ وار ہے اور جس کی سیاست ہر ایک حملہ کو روک سکتی ہے لیکن اس پر بھی سوامی دیانندجی مہاراج نے ہردوار چھوڑ کسی ادنےٰ سے ادنےٰ بُت پرستی کے مرکز میں بھی اپنی اصلاح کے کام کو استقلال کے ساتھ جاری کرنے کی جُرات نہیں کی اُنھوں نے تو اس نیک کام کے لئے اُسی گروہ کو اِنتخاب کیا جسے اسلامی روشنی اور تعلیم جدیدہ نے سوامی کی موحدانہ تحریک کے قبول کرنے کے لئے مُدّتوں پہلے طیّار کر رکھا تھا جس وقت ہم موجودہ آرام و آسائش والے اور پُرامن زمانہ کا مقابلہ اُس خطرناک زمانہ سے کرتے ہیں جو عربوں جیسی خونخوار مطلق العنان اور خلیع اللجام قوم نے مُلک عرب میں پیدا کر رکھا تھا۔ اور پھر اُس مخالفت پر نگاہ دوڑاتے ہیں جو اس مُلک کے کمزور دل کے اِنسانوں نے دیانندجی کے مقابل کی۔ تو ہم کو آسانی سے

سمجھ آجاتا ہے وہ انسان کیسا عظیم الشان جوہر استقامت اپنے اندر رکھتا ہوگا۔ جس نے عرب جیسے ملک کو اپنے جیتے جی کل کا کل بت پرستی سے پاک کر دیا +

بہر حال اہل مکہ نے نبی عرب کے مشن کی جاں توڑ مخالفت کی سب سے پہلے آں حضرت صلعم نے ان لوگوں سے جو آپ کا ساتھ دینا چاہتے ذیل کی چند باتوں کا اقرار لینا شروع کیا :-

میں خدا کو واحد جانوں گا۔ میں بتوں کی پوجا نہیں کروں گا میں جھوٹ نہیں بولونگا۔ میں زنا نہیں کروں گا۔ میں دختر کشی نہیں کرونگا۔ میں جوا نہیں کھیلوں گا۔ میں نیکی کے کاموں میں محمدؐ کی پیروی کروں گا +

باتیں تو بہت ہی سیدھی سادی تھیں اور مجھے سمجھ نہیں آتا کہ کیوں ایک شریف طبع انسان خواہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ آج بھی ان کو قبول کر کے مسلمان نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ اصل اسلام تو یہی ہے۔ لیکن ظلمت کے فرزند کچھ اس حد تک گمراہ ہو چکے تھے کہ ابھی معدودے چند اشخاص نے آنحضرت صلعم کے سامنے

امُور بالا کا اقرار کر کے آپؐ کا ساتھ دینا قبوُل کیا کہ قریش عرب بھڑک اُٹھے اور اس پاک تحریک کے مٹا دینے کی فکر میں لگ گئے۔ چنانچہ نئی سے نئی قسم کی رُکاوٹیں آئے دن آپؐ کی راہ میں پیدا کی گئیں آپؐ کو اور آپؐ کے ہمراہیوں کو طرح طرح کی اذیتیں پہنچائی گئیں۔ لیکن اُن سب کے مُقابل آپؐ میں ایک فوق الکرامت استقامت تھی جو سب پر غالب آگئی۔ سب سے اوّل جس جگہ بازار چوک یا کسی گُذرگاہ میں آنحضرت صلعم وعظ کے لئے کھڑے ہو جاتے۔ آپؐ کے مقابل گلیوں کے لونڈے اور بازاری لچّے لنگارے لگا دئے جاتے جو آوازے کستے پھبتیاں اُڑاتے۔ شور کرتے اور کئی اَور طریق پر آپؐ کے وعظ کے مخل ہوتے لیکن یہ ذمیمہ حرکات آپؐ کو کب اعلائے کلمتہ اللہ سے روک سکتی تھیں۔ کہیں کوئی مجمع یا میلا ہوتا شادی یا غمی کی تقریب ہوتی آپؐ تبلیغِ حق کے لئے وہاں پہنچتے۔ عرب شعر و شاعری کے تو جاں دادہ ہی تھے۔ اور ہر موقعہ پر ایک قسم کا مشاعرہ عرب میں ہو جایا کرتا تھا آپؐ بھی عموماً ہر ایسی مجلس میں پہنچتے اور جب اس زمانہ کے اُستاد اپنا اپنا کلام سُناتے۔ آپؐ

بھی قرآن کریم کی آیات مناسب موقعہ ومحل سُنا کر سامعین کو کلامِ ربّانی کی فصاحت و بلاغت کا متوالا کر دیتے اور کلام پاک کے آگے انھیں سربسجُود کراتے۔ اُس کا جو کچھ اثر اندر ہی اندر دلوں میں ہو رہا تھا اس سے عمائد قریش غافل نہ تھے۔

جب مذکورۂ بالا رُکاوٹیں الٰہی روشنی کو بُجھا نہ سکیں تو جسمانی اذیّت کی طرف اُن کا خیال ہُوا۔ چنانچہ ایک دفعہ جب آنحضرت صلعم ایک بازار میں کھڑے کلمۂ حق سُنا رہے تھے تو چند بدکردار آپؐ پر حملہ آور ہوئے آپؐ کے گلے میں ایک چادر ڈال دی گئی۔ اور قریب تھا کہ آپؐ کا گلوئے مبارک گھٹ جاتا کہ اتنے میں صدیق اکبرؓ کہیں سے وہاں آنکلے۔ اور آپؐ کو اُن نااہلوں کے ہاتھ سے چھڑایا۔ اسی طرح خانۂ کعبہ میں جو اُن دنوں ہر قسم کے مجمع کی جگہ ہوتا تھا آپؐ ایک دن جنابِ باری میں سربسجُود تھے کہ عمائد قریش کے اشارہ سے چند بدقماش اونٹ کا ایک شکمبہ (اوج) اُٹھا لائے جو غلاظت سے بھرا ہُوا تھا۔ آپؐ ابھی سجدہ میں ہی تھے کہ یہ شکمبۂ شُتر آپؐ پر ڈالا گیا۔ جس کے بوجھ تلے

آپؐ دب گئے اور آپؐ کا جسم مطہر اس کی غلاظت سے بھر گیا۔ اِرد گِرد عمائدِ قریش تلواریں سُوت کر کھڑے ہو گئے۔ جِس کا مطلب یہ تھا کہ کوئی آپؐ کا ہوا خواہ وہاں پہنچ کر آپؐ کو اِس تکلیف سے مُخلصی نہ دے سکے۔ عرب جہاں خُونخوار طبع تھے وہاں اچھّے خصائل کے بھی وارث تھے۔ وہ کسی عورت پر حملہ کرنا یا ہاتھ اُٹھانا اپنے لئے باعث عار سمجھتے تھے۔ اِس لئے حضُور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کسی دوست نے سیّدۃُ النّساء جناب فاطمہؓ کو اِس واقعہ سے اطلاع دی جو خانہ کعبہ میں تشریف لائیں۔ اور اس طرح آپؐ کو اس تکلیف سے نجات ہوئی۔ ہمچو قسم اور کئی طرح کی جسمانی اذیتیں آپؐ کو پہنچائی گئیں لیکن یہ باتیں اُس جوہرِ استقامت کو کب دبا سکتی تھیں کہ جو اس کامل فطرت میں من کُل الوجُوہ ودیعت شدہ تھی۔ مخالفین جب لفظی اور جِسمی اذیت سے نُورِ ازلی کی شعاعوں کو دِھیما نہ کر سکے تو آخر یہ تجویز ہوئی کہ آپؐ کی بات ہی کوئی نہ سُنے بلکہ جہاں آپؐ کھڑے ہوں وہاں سے سامعین کو ہٹا دیا جاوے قوم کا یہ حال تھا اور اُدھر جناب باری سے حُکم ہُوا کہ

یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ

(اے چادر والے اُٹھ اور قوم کو ڈرا)

اِس کلامِ ربّی کی تعمیل میں آخر آپؐ نے ایک تجویز سوچی۔ آپؐ ایک دن کوہ صفا پر چلے گئے اور ہر ایک قبیلہ کو اس کے نام سے بُلا کر پُکارا۔ یہ عرب کا طریق تھا کہ کسی خطرہ یا دشمن سے قوم کو آگاہ کرنے کے لئے اس طریق پر مختلف قبیلوں کو بُلایا جاتا تھا۔ چنانچہ جب قریش کے کُل قبیلے آپؐ کی آواز پر اس طرح جمع ہو گئے۔ تو سب سے اوّل آپؐ نے اُن سے دریافت کیا کہ کیا تم بتلا سکتے ہو کہ میں نے کبھی بھی جھوٹ بولا" +

اللہ اللہ کیا جُرأت ہے۔ اور اپنی راست گفتاری پر کس قدر اعتبار ہے۔ ایک شخص جو قریباً ترتالیس سال کی عمر پا چکا ہے وُہ اپنے خطرناک دشمنوں سے اپنی راست گُفتاری کی تصدیق چاہتا ہے۔ اور دشمن بھی وہ دشمن جو ہر وقت اُس کی تذلیل کی فکر میں ہیں۔ اس قسم کا سوال ایسے دشمنوں سے وہی انسان کر سکتا ہے۔ جس کی زبان عمر بھر کسی خفیف سے خفیف دروغ سے بھی

مُلوّث نہ ہوئی ہو ÷

حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کے اِس سوال پر عمائدِ عرب اس بات کے معترف ہوئے۔ کہ آپؐ ہمیشہ ہی صادق القول اور راست گفتار رہے ہیں۔ جس پر آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ مَیں تم کو اس دشمن کا پتہ دیتا ہوں جو عنقریب تُم سب کو ہلاکت کا مُنہ دکھا دیگا اور تمہاری شان وشوکت کو خاک میں ملا دے گا اور وہ دشمن خُدا کا عذاب ہے جو تم کو عنقریب آپکڑیگا۔ اگر تم اپنی بداعتقادیوں اور بدکرداریوں سے باز نہ آؤگے ÷ آپؐ کے اس کہنے پر عمائدِ قریش کا غیظ وغضب بھڑکا۔ سب سے پہلے آپؐ کے چچا ابُولہب نے آپؐ پر حملہ کیا۔ پھر کیا تھا چاروں طرف سے آپؐ کو اذیّت پہنچائی گئی۔ لیکن یہ باتیں کب خُدا کے مُرسل کو گھبرا سکتی تھیں وُہ اپنے کام میں لگاتار مصروف رہے۔ حتّٰے کہ آپؐ کے ہمراہیوں کی تعداد ۱۰۰ سَو سے اُوپر ہوگئی۔ اس پر آپؐ کے مخالفین نے یہ پسند کیا کہ آپؐ کے ہمراہیوں کو ستایا جائے۔ جو نومسلم کسی کے نوکر یا غُلام تھے ان کو قید کیا گیا۔ سخت دُھوپ

میں جلتی ہوئی ریت پر وہ مظلوم چت لٹائے جاتے اور اُن کی چھاتیوں پر پتھر رکھے جاتے۔ بعض کو کوڑے مارے گئے بعض کو قتل کیا گیا جو اس حیثیت کے نہ تھے اُن کو اور قسم کی تکلیفیں دی گئیں۔ لیکن آں حضرت صلعم کے نفوس طیبہ نے وہی استقامت کی زبردست رُوح اپنے صحابہ میں پھونک رکھی تھی۔ یہ امر تاریخ زمانہ نے مان لیا ہے۔ کہ ان ایام میں جو صدق و وفا ان خطرناک ابتلاؤں میں آپؐ کے دوستوں سے ظاہر ہوئی وہ اپنی آپؐ ہی نظیر ہے۔ اور اس سے اس قدسی طاقت کا پتہ لگتا ہے۔ جو خُدا تعالیٰ نے آپؐ میں ودیعت کر رکھی تھی صحابہ کرام کے مُقابل جناب موسٰےؑ کے ہمراہیوں کا ذکر کرنا یا حوارّیینِ مسیحؑ کا اشارہ کرنا خطرناک غلطی ہے +

جب صحابہ کرام کی یہ تکالیف بڑھ گئیں تو صاحب الصلوٰۃ والسلام نے مجبُور ہو کر بعض دوستوں کو ہجرت کرنے کے لئے حُکم دیا۔ چنانچہ ستّر صحابہ بسرکردگی جنابِ عثمان رضی اللہ عنہ حبشہ میں چلے گئے۔ کُفّارِ عرب نے بھی بالمقابل ایک وفد

(ڈیپوٹیشن) ان کی مخالفت میں بھیجا جہاں سے وہ خائب خاسر ہوکر واپس آیا۔ اوراس طرح مظلوم صحابہ کی جاے پناہ حبش کا علاقہ ہوگیا۔ اس سے مکّہ والوں کا جوش اور بھڑکا۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ آپؐ کو یا آپؐ کے صحابہ کو کسی قسم کی جِسمانی یا رُوحانی تکلیف دینا آپؐ کے عزم کو توڑ نہیں سکتا۔ اُنھوں نے آپس میں مشورہ کیا اور اُن اسباب کی تلاش کی جو بنی ہاشم کے اُس دُرِّ یتیم کو اپنے آبا و اجداد کے مذہب کی مخالفت میں کھڑا کر رہے تھے۔ اُن کی نگاہ الٰہیات تک تو پہنچ ہی نہ سکتی تھی وہ دُنیا کے پرستار تھے اور دُنیا کی محبُوب ترین چیزوں تک ہی اُن کی نگاہ محدود تھی۔ روپیہ عورت اور طاقت یہی تین چیزیں ہیں جو ہمیشہ سے کسی دُنیا دار کا معراج اور نصب العین ہُوا کرتی ہیں۔ اور عمائدِ قریش کی سمجھ میں بھی یہی تین امور بڑے محرک ہو سکتے تھے جو اُن کے نزدیک آنحضرت صلعم کو موجودہ نظام سوسائٹی کی تخریب پر مُستعد کر رہے تھے چنانچہ اُنھوں نے اپنے معبُودوں کی حمایت اسی میں سمجھی کہ یہ تین باتیں

آنحضرت صلعم کو مُہیّا کر دی جائیں۔ آپؐ ایک دن خانہ کعبہ میں تشریف رکھتے تھے کہ قریش کی ایک معزز جماعت آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ اور اُن کی طرف سے اُن کا ایک امیر عُتبہ نام آپؐ سے یُوں ہمکلام ہوا :۔

اے میرے پیارے بھائی تُو اپنی شرافت ذاتی اور شرافت حسبی نسبی کے لحاظ سے ہم سب میں ممتاز ہے لیکن تیرؐے وجُود سے ہم سب میں اس وقت فساد پڑ گیا۔ ہمارے خاندانوں میں تفرقہ پڑا ہُوا ہے۔ بعض ہمارے ساتھ ہیں اور بعض تیرؐے ساتھ۔ تُو ہمارے دیوی دیوتاؤں کو سخت سُست کہتا ہے۔ ہم اب تیرؐے سامنے ایک تجویز پیش کرتے ہیں تُو اس پر غور کر اور اگر تجھےؐ پسند خاطر ہو تو تُو اسے قبول کر اگر تجھےؐ دولت کی ضرورت ہے۔ تو ہم اِس قدر دولت تجھےؐ جمع کر دیتے ہیں۔ کہ ہم میں سے کسی کے پاس اس قدر دولت نہ ہو۔ اگر تجھےؐ حکُومت چاہئے تو ہم تجھےؐ

اپنا امیر اور بادشاہ کریں گے۔ اور کوئی امر تیرے مشورہ کے سوا نہ کرینگے۔ اور اگر کوئی عورت چاہیئے تو ہم اعلےٰ درجہ کی جمیلہ حسینہ عورت تجھے لادیں گے یا جو کوئی پسند خاطر ہو چکی ہے وہ بھی حاضر ہو سکتی ہے صرف ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے دیوی دیوتاؤں کے متعلق کچھ نہ کہا جاوے ✤

اس کے جواب میں آنحضرت صلعم نے پہلے سورہ حٰم کی ابتدائی چند آیات پڑھ کر ذیل کی آیاتِ قرآنی تلاوت فرمائیں :۔

اَلَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ كَذٰلِكَ یَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ (سورہ محمد)

ترجمہ ۔ یعنے جو لوگ انکار کرتے ہیں ۔ اور اللہ کی راہ بس

روک ڈالتے ہیں۔ ان کے اعمال اکارت جاویں گے۔ اور ان کے مقابل جو صداقتیں مان کر نیک اعمال کرتے ہیں۔ اور جو کچھ محمدؐ پر اُترا ہے اُسے قبُول کرتے ہیں۔ اور وہی حق اور صحیح ہے اور رب العالمین کی طرف سے ہے اُنکے حالات بھی اچھّے ہو جائیں گے۔ اور اُن کی بُرائیاں بھی اُن سے دُور ہو جائینگی۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ مُنکرین امورِ باطلہ کے پیچھے جا رہے ہیں۔ اور ماننے والوں نے اُس صداقت کو قبول کیا ہے جو ربّ کی طرف سے آئی ہے۔ خدا تعالیٰ اِس طرح مثالیں دے کر لوگوں کو سمجھاتا ہے ✣

یہ آیات پڑھ کر نبی کریمؐ نے عُتبہ کو کہا کہ یہ دو طریق تمہارے سامنے ہیں جس کو چاہو قبُول کر لو ✣

مخالف نقّاد میرے آقاؐ کی سوانح میں اس عظیم الشان واقعہ کو غور کریں اور پھر سوچیں کہ آپؐ کی نگاہ آیا رُوحانیات کی فلک الافلاک پر پرواز کر رہی تھی یا زمینی اور سفلی امور اُسے اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ قریش کا یہ ڈیپوٹیشن (وفد) کسی

چال یا فریب کی بنا پر نہ تھا نہ کسی دفعُ الوقتی کے خیال نے یہ
تجویز کرائی تھی۔ کیونکہ نبی کریمؐ کی حسبی نسبی شرافت آپؐ کو ان
تمام امور کا مستحق کرتی تھی جو عُتبہ نے پیش کئے تھے۔ اسلئے
آپؐ کو بادشاہ بنانا یا آپؐ کو اپنی دامادی میں لے لینا کسی طرح
بھی کسی قریش کے لئے باعث ننگ و عار نہ تھا۔ لہٰذا ان
بُزرگوں کی نگاہ میں جو بڑی سے بڑی بات انسانی کوششوں
کا باعث ہوسکتی تھی وہ اُنھوں نے آنحضرتؐ کے سامنے
بصدق دل پیش کردی۔ اگر آپؐ کی غرض صرف مُلک گیری اور
جاہ طلبی سے تھی تو پھر کیوں قریش کی یہ درخواست قبول نہ کی
گئی۔ وہ اُمور جو اس وقت سے پندرہ سولہ سال بعد بالفاظ
مخالفانِ اسلام آپؐ نے حاصل کرنے چاہے وہ بلا تکلیف
اُس وقت آپؐ کو حاصل ہوسکتے تھے۔ اگر خُدا پرستی اور خُدا
کے جلال کو زمین پر از سر نو قائم کرنا منظور نظر نہ تھا تو زن۔ زر۔
حکُومت کے سوا اور کونسی بات ہوسکتی ہے۔ جس کے لئے کُل
کی کُل دُنیا تو جد و جہد میں ہمیشہ سے لگی رہی ہو۔ اور وہ بات آپؐ کو

مُیسّر بھی آجائے اور آپؐ پرواہ تک نہ کریں۔ کیا اس سے بڑھ کر ان امُور کے حصُول کا اور کوئی موقعہ ہوسکتا تھا۔ آپؐ آسانی سے اس وقت بادشاہ ہوکر ان فتوحات کو ابھی سے شرُوع کرسکتے تھے جو بالفاظ مخالفانِ اسلام آپؐ نے اپنی زندگی کے آخری حصّہ میں اور آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے شرُوع کیں۔ اسی بات کے مُتعلّق یہ بات بھی غور طلب ہے کہ آپؐ کی موجُودہ حالت کیا تھی۔ نہ آپؐ کے پاس کوئی روپیہ تھا۔ نہ طاقت تھی۔ نہ کوئی ہمراہی صاحب طاقت تھے۔ زیادہ تر ضُعفا غُربا کا مختصر سے مختصر گروہ۔ رات دن کی مالی احتیاج مخالفین کی طرف سے طرح طرح کی تکلیف اور اذیّت۔ جس مشن کی تبلیغ مدنظر ہے اُس پر کوئی کان دھرنے والا نہیں۔ رات دن بدکرداروں کا ایک گروہ آپؐ کے ساتھ لگا ہوُا ہے کہ جہاں کہیں آپؐ تبلیغ حق کے لئے جائیں وہ خدا کی راہ سے لوگوں کو روکیں۔ نہ خود سُنیں نہ اَوروں کو سُننے دیں۔ ایسی کمزور حالت میں آپؐ کا اپنے مشن پر استقامت سے کھڑا رہنا آپؐ کی

صداقت کی کافی دلیل ہے۔ پس اگر چالوں سے ہی کام دُنیا
کے چلا کرتے ہیں تو مناسب تو یہ تھا کہ اس وقت دفع الوقتی
کے طور پر عُتبہ کی بات مان لی جاتی اور پھر آہستہ آہستہ اپنی
طاقت مضبوط کر کے بُت پرستی کو ملیا میٹ کیا جاتا۔ لیکن کیا
نبی کریمؐ نے عُتبہ کے جواب میں لطائف الحیل سے کام لیا یا
اُس مقتدر گروہ کو دندان شکن جواب دیا۔ آپؐ کو خوب علم تھا کہ
آپؐ کے سامنے کون بول رہا ہے۔ اور اُس کے ہمراہ کون
ہیں۔ وہ کس دل و دماغ اور طاقت کے اِنسان ہیں اُنکی دلجوئی
کہاں تک مُفید ہوگی اور اُن کی بات کو رد کر دینا کہاں تک
مُضرت کا موجب ہوگا۔ پھر اُن کے جواب میں وہ دُنیا اور دُنیا
کی چیزوں کو مردار اور بے حقیقت سمجھنے والا **انسانؐ** یہ بھی
تو نہیں کہتا کہ میں غور کر کے جواب دونگا۔ امرِ حق کے پہنچانے
میں اُسے یہ بھی تو خیال نہیں کہ اس کا دلشکن جواب اُسے
نہ معلوم کن خطرات میں مُبتلا کریگا۔ اُنھیں کہتا ہے تو یہ کہتا ہے
کہ تُم اور تمہاری کوششیں سب تباہ ہو جائیں گی۔ ہاں سرسبز

ہونگے تو وہ جو میری بات مان کر اُس پر کاربند ہوں گے
کیونکہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اُسے اللہ کی طرف سے کہہ رہا ہوں
جو ربّ ہے۔ جو انسان کی ربُوبیت کے طریق جانتا ہے اور
جس نے بہ تقاضائے ربوبیت مُجھؐ پر کلام نازل کیا ہے! اور
اس میں وہ طریق بتلائے ہیں جن سے اِنسان اور اس کے
قوائے کی حقیقی پرورش ہو سکتی ہے۔ اور تم جو اُن صداقتوں کو
قبُول نہیں کرتے اور لوگوں کو بھی ان صداقتوں کے قبُول
کرنے سے روکتے ہو تو تم سب کے سب لامحالہ ان راہوں سے دُور
جا رہے ہو جو انسان اور اُس کے قوٰے کی پرورش کی راہیں
ہیں۔ اللہ اللہ جواب کیا دیا۔ ساتھ ہی اُن کا انجام اور اُسکے
حکیمانہ وجُوہ اور دلائل بھی دے دیئے +

یہ واقعہ جہاں آنحضرت صلعم کے ربّانی مشن کی ایک دلیل ہے،
ساتھ ہی یہ ایک امتحان آپؐ کی استقامت کا بھی تھا۔ کیونکہ
جیسے کہ پہلے استقامت کی تعریف میں لکھا گیا ہے۔ کہ کسی امر
حقّہ کی خاطر مصائب کا مُقابلہ کرنے کا نام ہی استقامت نہیں

بلکہ ان تحریصات کا مقابلہ کرنا بھی اِستقامت کی شان ہے جو اس شخص کو امرِ حقہٗ کے چھوڑ دینے پر دی جائیں اور پھر وہ قبول نہ کرے ۔

اس جواب کا نتیجہ اَور کیا ہو سکتا تھا عمائد قریش سب کے سب دیوانہ وار برافروختہ ہوگئے۔ اور آپؐ کو خانہ کعبہ سے نکال دیا اور فیصلہ کر لیا کہ آپؐ کبھی خانہ کعبہ میں آیندہ نہ آئیں اس کے بعد وہ سب کے سب آپؐ کے چچا ابُوطالب کے پاس آئے ۔ اور اُس کو کہا کہ ہم زیادہ دیر تک صبر نہیں کر سکتے یا تو اپنے بھتیجے کو کہو کہ زبان روک لے ۔ یا تو خود طیار ہو جا تا کہ تم میں اور ہم میں فیصلہ ہو جائے ۔ اس پر ابُوطالب نے آپؐ کو طلب کیا ۔ اور آپؐ کو قریش کے ارادہ سے اور اُن کی دھمکی سے خبر دی اور کہا ۔ کہ "اے میرے بھائی کے بیٹے تُو اپنے آپ کو اور مُجھ کو بچا لے ۔ اور مُجھ پر وہ بوجھ نہ ڈال کہ جس کی متحمل میری ضعیف ہڈیاں نہیں" ۔

اللہ اللہ یہ ایک اَور امتحان استقامت ہے عُتبہ کو

جواب دے کر تو آتی ہوئی دولت ۔ عزّت اور وجاہت کو جواب دے دیا گیا ۔ اور اب چچا کی اس بات سے رہی سہی جو کچھ طاقت وحمایت ہے وہ بھی جا رہی ہے ۔ لیکن وہ انسان جس کی آنکھوں کے سامنے آٹھوں پہر کُل طاقتوں اور عزّتوں کا مالک خدا تھا ۔ اور جس خدا کے کہنے پر ہی وہ اس مشن پر کھڑا ہوا تھا وہ ابُوطالب کے اس کہنے پر کیا گھبرا سکتا تھا ۔ آپؐ نے فرمایا :-

اے چچا اگر تُو سُورج کو میرے دائیں طرف اور چاند کو میرے بائیں طرف رکھ دے اور مُجھ کو اس کام سے روکنا چاہے تو میں رُکنے کا نہیں ۔ حتّٰے کہ خُدا تعالیٰ میرے صدق کو ان پر ظاہر نہ کر دے یا میں اس کوشش میں فنا ہو جاؤں*

یہ امتحان بھی کس قدر کڑا تھا۔ لیکن جواب بھی کس شوکت و عظمت کا دیا گیا۔ اس جواب میں خدا اور اُس کے جلال کو قائم کرنے کے مقابل نہ صرف چچا کی ایک رہی سہی حمایت کو ہی چھوڑنا قبول کر لیا ہے۔ بلکہ اُن تمام چیزوں کو خدا کے نام پر قربان کرنا ظاہر فرمایا ہے۔ جو چاند اور سُورج کی طفیل دُنیا میں پیدا ہو رہی ہیں۔ سائنس دان دُنیا اس امر سے خوب واقف ہے۔ کہ دُنیا کی کوئی بھی چیز نہیں جس کی خلق۔ بقا اور قیام میں سُورج اور چاند کو دخل نہ ہو۔ ہماری کل اغذیہ۔ کُل ملبُوسات کُل شان وشوکت کی چیزیں الغرض کُل کی کُل دنیا اور مافیہا کا قیام سورج اور چاند کی ہستی کے ساتھ وابستہ ہے۔ گویا اِنسانی ہستی کے لوازمات ضروریہ کا سرچشمہ ہی یہ سُورج اور چاند ہیں۔ نبی کریمؐ نے اس مختصر سے جملے میں اپنے چچا کو جتلا دیا کہ تو کیا اور یہ عرب کیا اور تمہاری جماعت کیا۔ میں تو خدا کے نام پر اور اس کی پرستش و توحید کے قائم کرنے کے مقابل کُل کائنات کو چھوڑ سکتا ہوں +

آنحضرت صلعم نے یہ جواب دے کر چچا سے خود ہی رخصت چاہی۔ کیونکہ آپؐ سمجھتے تھے کہ آپؐ کا جواب مفارقت کیلئے تو کافی ہے لیکن ممکن ہے کہ چچا شرم کے باعث متامل ہو جائے اس لئے آپؐ خود ہی چچا سے رُخصت کے خواستگار ہوئے لیکن استقامت نے الواقعہ کرامت سے بڑھ کر ہوتی ہے یہ وہ کچھ کر سکتی ہے جو سحر اور جادُو سے ممکن نہیں۔ وہ ابُوطالب جو بُتوں کا حامی اور بُتوں کا پرستار ہے اور جس کے آبائی عقیدہ کی بیخکنی پر اُس کا بھتیجا تُلا ہُوا ہے۔ اور جس کو یہ بھی نظر آ رہا ہے کہ بھتیجے کی آیندہ حمایت کے معنی کُل کے کُل خاندان کی ذِلّت و ہلاکت ہے۔ وہی ابُوطالب ان تمام دُور اندیشیوں کے ساتھ اُس جوہر استقامت پر قربان ہوگیا جس کا ظہور آنحضرتؐ سے اس موقعہ پر ہُوا۔ اس نے کہا کہ یہ شرمناک بات ہے کہ ایسے بہادر اور جوانمرد کی حمایت نہ کی جاوے۔ اُس نے اپنے قبیلہ کے لوگوں سے اپیل کی جس پر بنی ہاشم اور بنی مطلب سب کے سب آنحضرت صلعم کی

حمایت پر کھڑے ہو گئے +

بنی ہاشم کے اس ارادہ نے کُل دیگر قبائل مکہ کو آمادہ بہ فساد کر دیا۔ اور کُل کے کُل بنی ہاشم کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ چنانچہ ایک تحریری معاہدہ کیا گیا جس کے رُو سے ان سب نے تین سال کے لئے بنی ہاشم سے میل جول لین دین بیع شرے بند کر دی۔ شادی غمی کی شرکت چھوڑی گئی۔ اور اُن کی حمایت و معاونت سے انکار کیا گیا۔ اس تحریر کو تقدیس دینے کیلئے احتیاط سے خانۂ کعبہ میں لٹکا دیا۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ بنی ہاشم کو اذیت دینے یا اُن کے افراد کو قتل کرنے والے۔ ہر ایک قسم کے مواخذہ سے باہر ہو نگے۔ بنی ہاشم کو بجز محصور ہو جانے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ایک پہاڑ کی کھوہ میں ابو طالب اور اُس کا قبیلہ پناہ گزین ہوا۔ باہر سے ہر قسم کی آمد اور رسد رسانی کے ذرائع قریش نے بند کر دیئے۔ اس کھوہ میں خدا کا رسولؐ اور اسؐ کا خاندان تھا اور ایسا ہی اسؐ کے رشتہ دار جن میں سے اکثر ابھی اسؐ کے مشن پر ایمان نہ لائے تھے۔

یہ لوگ مُتواتر تین سال تک اس جگہ بند رہے۔ باہر سے لوگ گُذرتے اور عورتوں اور بچّوں کے رونے کی آواز سُن کر بیچین ہو جاتے۔ جو بھُوک اور پیاس کے سبب اندر ہی اندر جان توڑ رہے تھے۔ خدا کی راہ میں اُس وقت **استقامت** دکھلانا ایک بھاری قربانی مانگتا تھا۔ ایسے وقت اُس اولوالعزم مُرسَل کو نہ صرف اپنی اور اپنے متعلقین کی جان کا ہی فکر تھا بلکہ اُس کا کُل کُنبہ اس کے اقربا اس کے عزیز جن میں سے اکثر ابھی اس کے ہم عقیدہ نہ تھے۔ اور اس کے ساتھ مصیبت میں گرفتار تھے۔ اور یہ سب کی سب مصیبت فی الفور ختم ہو سکتی تھی۔ اگر وہ کچھ وقت کے لئے اپنے عزم کو ڈھیلا کر دیتا۔ لیکن وہ اپنے عزم کا پکّا اور خُلق **استقامت** کا کامل مظہر تھا۔ عرب کی ایک پُرانی رسم کے مطابق سال میں بعض ایسے ایّام بھی آتے۔ جب کسی متنفّس پر ہاتھ چلانا یا حملہ کرنا حرام سمجھا جاتا تھا۔ آپؐ اُن دنوں اُس پہاڑ کی کھوہ سے نکلتے اور جہاں موقع پاتے تبلیغِ حق کا کام شروع کر دیتے ✦

اس محصوری پر جب پورے تین سال گذر گئے اور اس تمام تکلیف کے مقابل بھی آپؐ نے استقلال کو اپنے ہاتھ سے نہ دیا تو اس استقلال میں جو قدرتی جذب ہوتا ہے اُس سے بعض مخالفین کے دل پسیجے۔ خود قریش میں بعض ایسے آدمی پیدا ہو گئے جو ان محصورین کی نجات کی فکر میں لگ گئے۔ اُدھر وہ کاغذ جو خانہ کعبہ میں بصورتِ معاہدہ لٹک رہا تھا کرم خوردہ ہو کر گر گیا۔ کاغذ کا گرنا تھا کہ قریش کے چند نوجوان اس کھوہ کے دروازہ پر آئے اور امان کی صلائے عام دے کر محصورین کی نجات کا موجب ہوئے +

اس کاغذ کے متعلّق جس پر کُل قبائل قریش کا نام درج تھا عجیب واقعہ کتبِ تواریخ میں مندرج ہے۔ اس کاغذ کو ان تین سالوں میں کرموں نے کچھ اس طرح کھانا شروع کیا۔ کہ اس پر جس قدر عبارت تھی وہ آہستہ آہستہ سب کی سب مِٹ گئی۔ ہاں اگر کوئی لفظ ان جراثیم کے حملوں سے اُس کاغذ پر بچ رہا تو وہ اسمِ پاک محمدؐ ہی تھا +

ایک مادّہ پرست فلسفی گو اِس واقعہ کو اِتفاق کے سپُرد کردے۔ لیکن ایک اہلِ دل کیلئے اس واقعہ میں ایک لطیف عبرت خیز نکتۂ معرفت تھا۔ کاغذ معاہدہ نے اپنی لوح سے کل قبائل قریش کا نام محو کر کے اور خوُد ایک اسم پاک محمدؐ کو قائم رکھ کر اس بات کی طرف اشارہ کیا۔ کہ عنقریب جس طرح صفحۂ قرطاس سے مخالفینِ محمدؐ کے نام محو ہو گئے ہیں۔ اسیطرح صفحہ ہستی سے بھی اُن کے نام عنقریب مٹنے والے ہیں۔ اور جس طرح اس کاغذ پر صرف ایک مُقدّس نام باقی رہ گیا۔ اسی طرح کُل سرزمینِ عرب میں محمدؐ ہی محمدؐ رہ جائیگا۔ اور اس طرح قرآنی پیشگوئی یعنے ان شانئك هو الابتر (تیرے دشمنوں کا نام لیوا سرزمینِ عرب میں نہ رہیگا) کا ظہور چاروں طرف ہو جاے گا +

سرورِ کائنات علیہ الصلوٰۃ والتحیاۃ یوں کھوہ سے نکلنے کو تو نکلے۔ لیکن اب کوئی بھی توجّہ کے ساتھ آپؐ کی بات سُننا پسند نہیں کرتا تھا۔ قریش کا خوف لوگوں کو آپؐ کے پاس آنے سے روک رہا تھا۔ آخر ایک دن خدا کے نبیؐ کو خیال ہوُا کہ مکّہ کی نواحی

بستیوں میں جا کر تبلیغ حق کرے ۔ آپؐ اپنے غلام زیدؓ کے ہمراہ طائف کی طرف نکل گئے ۔ وہاں پہنچ کر ایک ٹیلہ پر کھڑے ہو گئے اور لوگوں کو پیامِ حق سُنانا شروع کیا ۔ کچھ دیر تک تو وہ لوگ آپؐ کی باتیں سنتے رہے ۔ لیکن اتنے میں ان کا ایک سردار وہاں آگیا جو آپؐ کے حالات اور نام سے کسی قدر واقف تھا اس نا اہل نے اس مجمع کو آپؐ کے خلاف بھڑکایا اور آپؐ پر پتھروں کی بارش شروع کی گئی ۔ ایک پتھر نے آپؐ کی پنڈلی شہید کی ۔ پنڈلی وہ جگہ ہوتی ہے جہاں تھوڑی چوٹ زیادہ سے زیادہ درد کا موجب ہو سکتی ہے ۔ زخموں سے خُون جاری تھا کہ آپؐ طائف سے ان مصائب کو جھیلتے ہوئے زید کے ساتھ ایک طرف چلے آئے ۔ جسم مبارک سے بہت سے خُون کے نکل جانے نے سخت تشنگی بھی پیدا کی ۔ نزدیک ہی ایک جھودی کا کُنواں تھا آپؐ وہاں پُہنچے اور چاہا کہ پیاس کو بُجھائیں کہ اتنے میں وہ جھُودی آگیا ۔ خدا کو شاید یہاں بھی امتحان استقامت منظور تھا کہ اس جھودی نے پانی

پینے سے روک کر پہلے آپؐ کا نام اور پتہ پُوچھنا چاہا۔ نام کا لینا اور عقائد کا بتلانا گویا اس خطرناک پیاس اور سخت بے لبسی کے وقت میں تھوڑی بہت لیکن نہایت ہی ضروری آسائش سے محروم رہنا تھا۔ لیکن اُسؐ مجسم استقامت اور حق کے جان دادہ علیہ الف الف صلوٰۃ والسلام نے لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے اعلان کو پانی پینے پر مُقدّم رکھا۔ جہُودی یہ توحید کا کلمہ سُن کر کب پانی پینے کی اجازت دے سکتا تھا۔ آپؐ نہایت تکلیف کے ساتھ اُس کُنْوئیں سے واپس آئے اور زیدؓ کے ہمراہ ایک کھجُور کے تلے آکھڑے ہوئے۔ سُبحان اللہ یہ کیسی بے بسی اور بے کسی کا وقت ہے۔ وُہ خدا کا محبُوبؐ جسؐ کی شان میں لولاک لما خلقت الافلاك آیا۔ جسؐ کے وُجُود نے دُنیا کو مُوجود کیا۔ اعلائے کلمۂ حق کیلئے کن حالوں پُہنچا ہے۔ لیکن بل بے استقامت ممکن نہیں کہ یہ ساری کی ساری تکالیف اُسؐ کو اپنے عزم میں ایک اِنچ بھی پیچھے کر دیں۔ آپؐ کا دل بھر آیا وقت بھی ایک طرح تنہائی

کا ہی تھا۔ آپؐ نے جناب باری میں ہاتھ اُٹھائے۔ اور یُوں دُعا فرمائی :-

اللھم اھد قومی اللھم اھد قومی انھم لا یعلمون۔

اے میرےؐ **خدا** میریؐ قوم کو ہدایت دے۔ یہ مجھےؐ نہیں جانتے اور پہچانتے۔ اے میرےؐ **خدا** تُو اِن کو سمجھا اور اِن کو ہلاکت مت دے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے یا ان کی اولاد میں سے کوئی سعید رُوح پیدا ہو جو **تیری** کلام سُنے اور قبول کرے میرےؐ **مولا** میں **تیرے** ہی پاک چہرہ میںؐ پناہ لیتا ہوں اگر تُو میرےؐ ساتھ ہے تو مجھےؐ کُچھ خطرہ نہیں ..... الخ

ایک سخت سے سخت مخالفِ اسلام ان تکالیف پر غور کرے جو کئی سالوں سے اُس معصُومؐ کو کسی ذاتی غرض سے بھی نہیں بلکہ قوم کی خیر خواہی میں قوم کے ہاتھ سے پُہنچ رہی ہیں پھر اُس خاص وقت کو سوچے جس وقت نازک سے نازک حصّہ جسم پر چوٹ آئی ہوئی ہے خُون جاری ہے۔ جسم پتّھروں سے چُور ہو چکا ہے سخت پیاس ہے اور ایک پانی کے گھُونٹ تک

کی بھی قوم روادار نہیں۔ پھر اس رحیم دل کو دیکھے کہ جس نے رحمۃ اللعالمین سے خدا کی جناب میں یہ عرض کرائی کہ میری قوم کو ہلاک نکر بلکہ میری قوم کو ہدایت دے کہ وہ مجھے پہچانیں۔ عیسائی دوست اُن الفاظ پر بھی غور کریں جو مسیح کے مُنہ سے ایسے موقع پر نکلے۔ پھر مسیح کی چند ساعت کی تکلیف کا اُن سالہائے دراز کی قسما قسم کی تکالیف سے مقابلہ کر کے اُس دل کی وسعت پر غور کریں جو اپنے ظلم رسانوں کے ہدایت کا مُلتجی ہو رہا ہے۔ مسیحؑ تو اپنی قوم سے مایوس ہے لیکن محمدؐ اپنی قوم سے مایوس نہیں۔ اُسکی نگاہ صرف اپنے مخاطبین پر ہی نہیں بلکہ وہ اُن کی اولاد اور اُن کی اولاد کی اولاد تک کی خیر خواہی کو زیر نظر کئے ہوئے ہے ✣

آنحضرتؐ کی دُعا میں ایک یہ فقرہ کہ ان کو ہلاک نکر ممکن ہے ان کی اولاد میں کوئی سعید رُوح ہو بہت ہی نتیجہ خیز اور سبق آموز ہے۔ نزول عذابِ الٰہی کے وقت جس نے ہمارے زمانہ میں طاعون۔ زلازل اور طوفانوں کی صورت اختیار

کی ہوئی ہے بعض حقیقی بدکرداروں کا بچ جانا کسی اسی قسم کی مصلحت پر مبنی ہؤا کرتا ہے۔ کہ جن کے لئے حضور علیہ السلام اپنے زمانے کے بدکرداروں کے ہلاکت سے بچنے کے لئے اپنی دُعا میں شفاعت فرما رہے ہیں +

نبی کریمؐ کے منہ سے یہ درد بھری دُعا کیا نکلی سیدھی آسمان پر پہنچی اور وہاں سے مقبولیّت ربّانی لیکر واپس آئی۔ آپؐ طائف سے واپس مکّہ کو آئے جہاں اُن اسباب نے پیدا ہونا شروع کیا کہ جن کا نتیجہ اُن تمام تکالیف کا خاتمہ تھا +

یہ ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ کہ اہل مکّہ آپؐ کے پند و نصائح کی طرف اب بہت ہی کم توجّہی کرتے تھے۔ اس لئے آپؐ نے اپنی توجّہ اب اُن لوگوں کی طرف کی جو زیارتِ کعبہ کی غرض سے یا تاجرانہ اغراض سے مکّہ میں آئے دن باہر سے آتے تھے۔ آپؐ مکّہ کی مختلف سراؤں میں جاتے اور جہاں کہیں کوئی نووارد پاتے اُسے خدا کا پیغام سُناتے۔ اہل مکّہ بھی اس بات سے بے خبر نہ تھے۔ انھوں نے ایک جماعت کو آپؐ کے

مقابل کھڑا کیا۔ جن میں سے بعض لوگ مکّہ کے مختلف دروازوں پر بیٹھے رہتے تھے اور ہر ایک نووارد کو آپؐ کی طرف سے مُتنبہ کرتے۔ اُن کو اطلاع دیتے کہ محمدؐ نام ایک ساحر اُن میں پیدا ہُوا ہے اُسؐ کی باتوں میں اِس قدر جادُو ہے کہ جو اُسؐ سے گفتگو کرتا ہے اُسؐ کے دام میں آجاتا ہے۔ اُسؐ کے پاس ایک کتاب ہے وہ کتاب کچھ ایسی سحر انگیز ہے کہ جِس نے پڑھا وہ فریفتہ ہوگیا۔ اِس طرح اہلِ مکّہ نوواردوں کو آپؐ سے ملنے یا آپؐ کی باتیں سُننے سے روکتے۔

ایک اہلِ دل کے لئے یہ باتیں جو نبی کریمؐ کے مقابل اُن کے معاصرین کہتے تھے اُنؐ کی صداقت کی ایک کامل دلیل ہیں کیونکہ آپؐ سے پہلے اور آپؐ کے بعد جب کوئی خدا کا بندہ دُنیا میں پیدا ہُوا اُس کی باتیں سُننے سے اور اُس کی تصنیف کے مطالعہ سے اِنھیں الفاظ میں اُس کے مخالف معاصرین نے اَوْر لوگوں کو روکا۔ اُس کے مخالف لوگوں کو یہی کہتے رہے کہ دیکھو اُس کے پاس نہ جاؤ۔ اُس کی باتیں نہ سنو۔ اُس کے

متبعین سے مت ملو۔ اُن کی کتابیں مت پڑھو۔ دراصل
وہ اُس معجز نما اثر کو جو ایسے ربّانی انسان کے کلام میں ہوتا ہے
محسوس کرکے اُس کا اس طور سے اعتراف کیا کرتے ہیں۔
یہی باتیں مسیحؑ کے مقابل انیس سو برس ہوئے کہی گئیں۔ اور یہی
باتیں آنحضرت صلعم کے مقابل دوہرائی گئیں۔ اور یہ وہ امور ہیں کہ
جن سے من وجہٖ ایک مدعی کی صداقت پر مُہر لگتی ہے +

مخالفینِ مکّہ شہر میں نو واردوں کو آنحضرتؐ کے پاس آنے
اور آپؐ کے مبارک کلام کو سُننے سے روکتے رہے۔ لیکن
ربّانی تحریک اندر ہی اندر کام کرتی رہی۔ حتےّٰ کہ ایک کافی تعداد
مدینہ میں آپؐ کے انصار کی پیدا ہوگئی +

اس نئی جمعیت کی خبر جب قریشِ مکّہ کو ہوئی تو وہ بہت گھبرائے
وہ ہر ایک قسم کی ایذا جو ایک بدفطرت دماغ کسی معصوم کو پہنچانے
کے لئے تجویز کرسکتا ہے آنحضرت صلعم کو پہنچا چکے تھے۔ اور
اس نتیجہ پر آ چکے تھے کہ اُن کی ہر ایک کوشش آں حضرتؐ کی
استقامت کے مقابل ہیچ تھی۔ اِس لئے اُنھوں نے یہی

سوچا کہ آپؐ کی جان پر حملہ کر کے اپنے بُتوں کو آئے دن کی ذلّت سے ہمیشہ کے لئے بچا لیا جائے۔ کُل قریش کے قبیلے اس سازش کے لئے **دارُالندوہ** میں جمع ہوئے۔ اور یہ تجویز ہوئی کہ ہر ایک قبیلہ کا ایک ایک آدمی ایک ہی وقت آپؐ پر حملہ کرے۔ تاکہ کوئی خاص قبیلہ ذمہ وار نہ ٹھیرایا جائے اِدھر کُفّارِ عرب یہ تجویز کر رہے تھے۔ اُدھر فتح و نُصرت آنحضرتؐ کے قدم چُومنے کو طیّار ہو رہی تھی۔ وحی الٰہی نے آپؐ کو مخالفین کے اِس بدمنصُوبے سے اطلاع دی۔ اور وہ اسباب پیدا کر دیئے کہ جن سے سب دشمنوں کی آنکھ میں خاک پڑی۔ اور آپؐ بخیر و عافیت مدینہ مُنوّرہ میں پہنچ گئے جہاں آپ کی سرتوڑ کوششیں تبلیغ حقّہ میں مُتواتر جاری رہیں۔ اور آپؐ اس دُنیا سے ایسے وقت رُخصت ہُوئے کہ جب آپؐ اُس امر کو دنیا میں قائم کر گئے کہ جِس کے لئے آپؐ مبعُوث ہوئے تھے ✣

یہ مختصر سے مختصر واقعات جو ان اوراق میں آپؐ کی تیرہ سالہ ابتدائی زندگئ نبوّت کے مُتعلّق لکھے گئے ہیں خُلق استقامت

کی کامل تشریح کرتے ہیں۔ کہ کس طرح آپؑ ایک امرِ حقّہ پر کھڑے ہُوئے۔ کس طرح آپؑ نے اپنی اور اپنے دوستوں کی جسمانی آسائش و آرام کو اس امر کی خاطر قُربان کیا۔ کس طرح مالی اور رُوحانی تکالیف میں اپنے آپ کو ڈالا۔ کس طرح ہر اذیّت اور مصیبت کا مقابلہ صبر کے ساتھ کیا۔ ہر ایک تحریص کو جو آپؑ کو امرِ حقّہ کے چھوڑنے پر دی جاتی تھی آپؑ نے نفرت سے دیکھا۔ الغرض ہر ایک قسم کی قُربانی آپؑ نے امرِ حقّہ کے لئے کی لیکن اس بات کو نہ چھوڑا کہ جس میں آپؑ نے خلقُ اللہ کا فائدہ دیکھا۔ ہاں جب آپؑ کی جان پر آ بنی تو پھر اپنی کوششوں کے مقام کو بدل دیا لیکن اس امرِ حقّہ کو نہ چھوڑا کہ جو آپؑ کی زندگی کا مشن تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے۔ کہ آپؑ نے کیوں جان کو اس طرح بچایا۔ لیکن اِس طرح جان کو دے دینا گویا اُس مشن کو اپنے ہاتھ سے تباہ کر دینا تھا۔ کہ جِس کے لئے آپؑ اِس قدر ان تیرہ سالوں میں قُربانی کر چکے تھے۔ الغرض آپؑ نے اپنی مثال سے ایک اعلیٰ درجہ کا سبق ہم کو دیا۔ کہ انسان جس بات کی

حمایت پر کھڑا ہو۔ ضرور ہے کہ وہ اپنے اندر کوئی امر حقہ رکھتی ہو
پھر اس امر حقہ کے قائم کرنے میں اپنی جان تک لڑا دے۔ اور
ہر ایک قسم کی قربانی کرے۔ ہاں جب جان پر بنے تو اپنا مقام
بدل دے۔ آج ہم مسلمان جو اُسی صاحب الصلوٰۃ والسلام کے
نام لیوا ہیں اس جوہرِ استقامت کے نہ ہونے پر ہر ایک امر
میں ناکام رہ چکے ہیں۔ کوئی ہمارا کام نہیں جو سر چڑھے۔
خدا کی شان ہے کہ نبی کریمؐ تو اپنے کُل مفاد اور آسائش گنوا کر
استقامت کا سبق دُنیا کو دے جائیں۔ اور ہم اُنکے مُتّبع اور خُدّام
ہی سب سے پہلے اُس مبارک سبق کو بھول جائیں العجب ثم العجب!

استقامت کا یہ کامل نمونہ جو آنحضرت صلعم سے اس طرح
ظہور پذیر ہُوا۔ کُل زمانہ کی تاریخ میں اپنی آپ ہی نظیر ہے
اس میں شک نہیں کہ اس دُنیا نے کوئی اُولوالعزم انسان ایسا
نہیں دیکھا کہ جس سے حسب ضرورت و حالاتِ وقت استقامت
کا ظہور نہ ہوا ہو۔ لیکن مقابلتہً ہمیں دُنیا کی تاریخ میں ایک
بھی انسان ایسا نظر نہیں آتا کہ جس کی راہ میں اس قدر مصائب

مختلف شکلوں اور صورتوں میں پیدا ہوگئے ہوں۔ اور پھر وہ ان سب کا مقابلہ کرتا ہوا امر حقہ کو ہاتھ سے نہ چھوڑے اس لئے اُس فوق العادت **استقامت** کا یہی تقاضا تھا کہ آپؐ کو **کامیابی** بھی وہ نصیب ہو جو دُنیا میں آپؐ کی مُقدّس **جماعت** انبیاءً کے کسی اور فرد نے نہ دیکھی ہو۔ اسرائیلی انبیاء میں کوئی بھی نبیؑ نظر نہیں آتا کہ جس نے اپنے وطن میں اور اپنی زندگی میں اپنے اور خدا کے دشمنوں کو اپنی آنکھ سے خائب و خاسر دیکھ کر حضور علیہ السلام کی سی بیّن کامیابی بھی دیکھی ہو۔ جناب موسٰےؑ آخر اپنے رفیقوں کی بدعنوانیوں سے تنگ آکر موعُود زمین تک اُنھیں نہ پہنچا سکے۔ مسیحؑ نے صلیب پر چڑھ کر آخر بڑی حسرت سے گلیل اور اُس کے گرد و نواح کو چھوڑا۔ شری مہاراج رامچندر جی اور شری کرشن بھگوان بالضرور ظالموں کے برخلاف جہاد کرنے میں کامیاب ہُوئے۔ اور فاسق و فاجروں کو تہ تیغ کر کے میرے مولا اور آقا صلوۃ اللہ علیہ کے دفاعی جنگوں کا ڈیفنس اپنے ہاتھ سے اپنی قوم میں و صیتاً

چھوڑ گئے۔ لیکن رُوحانی اصلاح کے پہلُو سے ویسی کامیابی کو نہ دیکھ سکے۔ جو سید المرسلینؐ کو خدا نے عطا کی۔ کیونکہ ان ہر دو بزرگوں کا انجام خوش کن نہیں بتلایا جاتا۔ ہاں اِن سب کے مقابل کُل دُنیا کے دیگر اُولوالعزم اِنسانوں اور ایسا ہی کُل معشر الانبیا میں **خاتم النبّیینؐ** کی ہی ذات بابرکات علیہ الصلوہ والتحیاۃ ہمیں نظر آتی ہے کہ جسے فوق الطاقت **استقامت** کے بدلے فوق العادت **کامیابی** نصیب ہوئی۔ آپؐ کا بڑا بھاری مشن اوّل عرب سے اور اُس کی اتّباع میں کُل دُنیا سے بُت پرستی کو مٹا دینا تھا۔ اس بُت پرستی کی حمایت میں آپؐ کے بھائیوں نے آپؐ کو وطن مالوف سے نکالا۔ لیکن اس وطن مالُوف میں آپؐ چند ہی سال کے بعد یسعیاؑ نبی کی پیشگوئی کو پورا کرتے ہوئے دس ہزار قدّوسیوں کے ہمراہ داخل ہوئے۔ اور داخل ہوتے ہی اپنے دشمنوں کی جان و مال کے مالک و قابض ہو گئے۔ اور خانہ کعبہ کو آناً فاناً بُتوں سے پاک کر کے اپنے جدامجد ابراہیمؑ کی دُعاؑ کو پُورا کیا +

ؔ واجنبنی و بنی ان نعبد الاصنام۔ اے میرے مولا مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا +

فتح مکّہ تاریخ زمانہ میں اپنی آپ ہی نظیر ہے۔ دُنیا میں کوئی مُلک یا قوم ایسی نظر نہیں آتی۔ کہ جِس کا فتح ہو جانا کسی قسم کی خُونریزی کے بغیر وقوع میں آیا ہو۔ اس قاعدہ عامہ میں اگر استثنا ہے تو صرف اسی ایک واقعہ سے ہے۔ عجیب بات ہے۔ کہ باہر سے غنیم شہر میں داخل ہو بالمقابل جنگجو۔ نبرد آزما اور غیُّور قبائل کے اراکین ہوں۔ اور فریقین میں سے ایک کا ہاتھ بھی تلوار تک نہ جائے۔ اور خون کے ایک قطرہ تک سے بھی زمین کا رنگ نہ بدلے ✣

دراصل مثیلِ موسےؑ کی شوکت وجمعیّت نے کچھ ایسا رُعب فراعین مکّہ پر ڈالا کہ وہ سب کے سب ہیبتِ الٰہی سے مرعُوب ہو گئے اور اسیرانہ آپؐ کے حضُور خود بخُود حاضر ہو گئے ✣

یہ نظارہ بھی عجیب وغریب نظارہ تھا۔ فیصلہ کا دن آگیا اور یوم الدین نے مثالی رنگ میں اپنا منہ دکھلایا۔ دو جماعتیں بالمقابل صف بصف موجود ہیں۔ ایک طرف ظالم لیکن خائب وخاسر۔ دوسری طرف مظلوم لیکن منصور ومظفر۔ پہلا

گروہ اگران ایذاؤں کو یاد کر کے پچھتا رہا ہے جو اس کے ہاتھ سے جسمانی رُوحانی اور مالی طور پر دوسرے گروہ کو پہنچیں۔ تو دوسرا اس فتح پر ناز کر رہا ہے جس نے ظالم کو آخر کار اپنے کیفر کردار تک پُہنچایا۔ فاتح گروہ میں اگر بعض ایسے بھی ہیں جو آنکھوں میں ہی مفتوحوں کو ان کے مظالم یاد دلا کر انتقام کا اشارہ کر رہے ہیں۔ تو بعض ایسے بھی ہیں جو غرور کا سر نیچا دیکھ کر خدا کی عظمت و جلال کو یاد کرتے ہوئے اُن ذلّت رسیدوں پر نظر ترحم ڈال رہے ہیں۔ ہاں سب کے سب ایک انسانؐ کے لب ہلانے کے مُنتظر ہیں +

عجب اُمید و بیم کا منظر ہے۔ دونوں طرف خیال ہو رہا ہے کہ تیرہ سالہ مظالم کا انتقام کس طور پر ہو گا۔ فاتح (صلعم) نے نہ صرف اپنی ذاتی تکالیف کا ہی بدلہ لینا ہے۔ بلکہ اپنے ہمراہیوں کی لاانتہا ایذاؤں اور نقصانوں کا انتقام بھی اُسکے زیر نظر ہے۔ وہؐ اپنے اِرد گرد جس کو دیکھتا ہے شکار ستم اور نخچیر جفا ہی پاتا ہے۔ بالمقابل جو اسؐ کے سامنے آتا ہے۔ وہ

وہی ہے جو ایک نہ ایک رنگ میں اپنے سفاکانہ جوہر دکھلا چکا ہے۔ اور تو اور اسؐ کے پہلو بہ پہلو صدیق اکبرؓ۔ عمرؓ۔ عثمانؓ۔ اور علیؓ بھی موجود ہیں۔ جن میں سے اگر ایک نے سر بازار ذلّت دیکھی تو دوسرے کی وجاہت ذاتی اُسے بے سیاست ہونیسے نہ روک سکی ایک اگر دو دفعہ وطن چھوڑ حبشہ میں پناہ گزین ہوا۔ تو دوسرا برابر تین سال اپنے مظلوم قبیلے کے ساتھ ایک پہاڑ کی کھوہ میں محصور رہا۔ ہجرت کی رات اگر بستر نبیؐ پر لیٹ کر شیرِ خدا کو جان کو ہتھیلی پر رکھنا پڑا تو یارِ غار نے اپنے محبوب کے نقشِ پا کو سُراغ رساں دشمن کی نگاہ سے چھپانے کے لئے اسؐ مطاعِ عالم کو اپنی گردن پر اُٹھایا۔ اور اس طرح اپنے نقش پا کا نشان چھوڑ کر اپنی جان کو جوکھوں میں ڈالا۔ بلالؓ کا اگر کوڑے کھانا اور جلتی ہوئی ریت پر دین کی خاطر لٹائے جانا اس روز انتقام میں آنحضرتؐ کے نظر تلے ہوگا۔ تو عمارؓ بن یاسر کی شکل بھی آپؐ کو اس کے والدین کی مظلومانہ شہادت کی یاد دلاتی ہوگی۔ کہ جب یاسرؓ کی ٹانگیں اور بازو چار مختلف سمت

کی طرف مُنہ کئے ہوئے اُونٹوں سے باندھے گئے۔ پھر اونٹوں کو مار کر بھگایا گیا۔ اور اس مظلوم کے جِسم کو پارہ پارہ کیا گیا۔ الغرض ساری کی ساری مصیبتیں تکلیفیں اور ایذائیں مکّہ کے مختلف منظر دیکھ کر آن واحد میں نگاہ کے نیچے آ گئی ہونگی جو آپؐ کے رُفقا علیہم السّلام کو مختلف مواقع پر کُفّارِ عرب نے پہنچائیں۔ وہ اس قسم کی تھیں کہ جن کی یاد جِسم پر رونگٹے کھڑے کرنے کو کافی تھی ❊

انتقاماً ان بدقماش مُوزیوں کے لئے جو کچھ سزا بھی تجویز ہوتی وہ عقلاً نقلاً۔ شرعاً عرفاً بجا اور درست ٹھیرتی۔ سیاسی تاریخ اور ایسا ہی مُقدّس تاریخ ان واقعات سے مملُو ہے کہ جہاں فاتح اِنسانوں نے خواہ فرمانروائے ملک تھے یا مذہب کے ہادی۔ ایسے وقتوں میں خطرناک سے خطرناک سزائیں ایسے مظالم کے عوض اپنے مفتوح مخالفوں کو دی ہیں جو مکّہ والوں کے مظالم سے بہت ہلکے اور کم درجہ پر تھے۔ مثال کے طور پر اگر آنحضرت صلعم ان ظالموں کے گھر جلا دیتے تو یہ وحشیانہ فعل

نہ سمجھا جاتا۔ آخر آپؐ سے پہلے راجہ رامچندر جی راون کے ایک فعل سے کل کی کل لنکا کو جلا ہی چکے تھے۔ وہاں تو ایک سیتا جی لیجائی گئی تھیں اور یہاں تو بیسیوں صحابہ کی بیویاں بچے اُن سے جُدا کئے گئے تھے۔ بھلا شری مہاراج کا واقعہ تو شائد فسانہ کا ایک رنگ اپنے اندر رکھتا ہے۔ ہمارے سامنے تو مُہذّبوں کی سرتاج برٹش گورنمنٹ نے بھی بعض شورہ پشتوں کے باعث مہم ذکّہ خیل میں بازارویلی کو جلا دیا۔ اُن قریش کے سفّاکوں کو اگر تہ تیغ کیا جاتا یا اُن کے زن و بچّے ہلاک کئے جاتے تو کوئی غیر معمولی واقعہ نہ ہوتا۔ آخر یوشعؑ نبی کی تلوار نے اگر مصر و شام میں مقابل کے دشمنوں کے علاوہ اُن کی عورتوں بچّوں اور ان میں کے بُوڑھوں کو بھی نہ چھوڑا تو ہندوستان میں کرشن جی مہاراج نے کورو چھتر میں کوروُں کے خُون سے ندیاں بہائیں۔ اور دُور کیوں جائیں غداران دہلی کے ساتھ ۱۸۵۷ء میں کیا کچھ نہیں ہوا۔ ایسا ہی اِن دُشمنانِ راستی کو اگر غلام بنالیا جاتا تو اُس کو

تہذیب ضروری اجازت دے دیتی - ابھی کل کی بات ہے کہ
ہم نے اپنی آنکھ سے ایبٹ آباد وغیرہ (مضافات ہندوستان)
میں ٹرانسوال کے بوئر اسیرانہ حالت میں دیکھے۔ حالانکہ انھوں
نے اپنے فاتحین کا مقابلہ تو صرف اپنی حفاظت کیلئے ہی کیا تھا۔
الغرض کوئی بھی انتقامی سزا کُفّارِ عرب کے لئے آنحضرت صلعم
تجویز کرتے۔ وہ سزا حالات مقابلہ کے لحاظ سے اُن سزاؤں
کی نسبت بہت تھوڑی ہوتی جو مہذّب سے مہذّب فرمانروا اور
مقدّس سے مُقدّس ہادیانِ ہدایت مُختلفہ اپنے وقت تجویز کرچُکے
تھے۔ لیکن اگر آپ بھی ان اُلوالعزم بزرگوں کے نقش قدم پر
چلتے تو اس عظیم الشان **خلق** کا خُون ہوجاتا کہ جِس کے اظہار
کا وقت اب آن پہنچا تھا۔ اور جِس کے مناسب زمانہ نے
واقعات بھی پیدا کر دیئے تھے ؛

عفو ایک عظیم الشان خلق ہے جس کا ظہور بہت ہی کم دیگر
اُلوالعزم انسانوں سے ہوا ہے۔ اس کے اظہار کے لئے ضرور
ہے۔ کہ پہلے ایک شخص خطرناک طریق پر ستایا جائے۔ پھر

انقلاب زمانہ اس کے ستانے والوں کو اس کے سامنے مغلوب اور ہزیمت خوردہ حالت میں بغرض انتقام لے آئے۔ اس کو طاقتِ انتقام بھی حاصل ہو اور انتقاماً جو کچھ وہ سزائیں تجویز کرے وہ حالاتِ ماضیہ کے ماتحت عین مناسب و موزوں ہوں لیکن پھر وہ اپنے دشمنوں کو معاف کر دے کُل اقوام کے ہادیوں میں سے اگر یہ حالات کسی کو میسّر بھی آئے تو وہ صرف نبی کریم علیہ السّلام و التکریم کو ہی میسّر آئے۔ اور اگر آپؐ بھی اُن حالات کے مناسب حال اس **خلق کریم** کا اظہار نہ فرماتے۔ تو پھر آپؐ کے انسان کامل ہونے میں کلام ہو جاتا۔ چنانچہ عین حالتِ امید و بیم میں آپؐ نے اپنے دشمنوں سے دریافت کیا۔ کہ تم اپنے مظالم کے مُقابل مُجھ سے کیا امید رکھتے ہو۔ میںؐ تم سے اب کیا سلوک کر سکتا ہوں۔ وہ لوگ حضور والا کے کریمانہ اخلاق اور فیّاضِ قلب سے ناواقف نہ تھے۔ اُنھوں نے بیک زبان عرض کی ؎

آپؐ کی ذاتِ مُقدّس ہے کہ تم ابنِ کریم
بس وہی کیجئے کرتے ہیں جو اعدا سے کریم

یہ مطالبہ بالکل سچّا تھا۔ اور ان کی امیدیں بھی غلط نہ تھیں آپؐ نے بجواب فرمایا۔ کہ تم میرے بھائی ہو۔ اور مَیں تم کو وہی کہتا ہوں جو یوسفؑ نے اپنے بھائیوں کو کہا۔ لا تثریب علیکم الیوم۔ تم سب مُعاف تم پر آج کوئی گناہ نہیں +

یہ رحم یہ بخشش یہ کرم اللّٰہ النفسی! جاؤ تاریخ کے صفحے چھان مارو اور اگر اسؐ کی مثال زمانہ کی تاریخ میں آج تک تمہیں ملے تو ہمیں دکھلاؤ۔ واِلّا اس عظیم الشّان انسانؐ کے قدم چومو۔ اُسکی حلقہ بگوشی اختیار کرو۔ اور اُسؐ کی غلامی میں آجاؤ۔ تم اپنے اپنے ہادیوں کی بھی عزّت کرو۔ اُن کے نمونے بھی قابل اتباع سمجھو۔ لیکن جو امر اُن کی زندگی تم کو نہ دکھلا سکے تو شرط انصاف بھی ہے۔ کہ اس معاملہ میں کم ازکم اس اسوہ حسنہ کے متبعین بن جاؤ۔ آؤ ہندوستان کی تاریخ کا ایک ورق اُلٹائیں اور کُرو چھتر کے میدان کے مقابل قوّتِ متخیّلہ کے ذریعہ پُہنچ جائیں

شری بھگوان کرشن جی مہاراج رتھ میں براجمان ہیں۔ آپ کی رتھ بانی ارجن جی کر رہے ہیں۔ میدان کارزار کی طرف رتھ جا رہی ہے۔ سامنے کورو بھی اپنے لشکر کی طیاری اور حوصلہ افزائی میں مصروف ہیں۔ اِدھر پانڈو سردار نبرد آزمایانہ اُمور میں مصروف ہیں۔ کیا زمانہ کی چال ہے کہ جس نے ایک ہی خاندان کی دو شاخوں میں مٹ بھیڑ کرا دی ہے۔ دونوں سرگروہ ایک ہی خاندان کے چراغ ہیں۔ دونوں طرف کے لڑنے والوں میں ایک دوسرے کے عزیز دوست رفیق موجود ہیں۔ لیکن آج رشتہ دار رشتہ دار کو اس دُنیا سے رُخصت کرنے پر تُلا ہُوا ہے۔ یہ منظر دیکھ کر ارجن کا دل بھر آیا۔ اور اُس نے شری کرشن بھگوان کی خدمت میں عرض کی :-

اے بھگوان[1]! آپ جو اس جنگ کا حکم دیتے ہیں تو کن کے ساتھ وہ جو ہمارے بھائی اور خُون کے رشتہ دار ہیں مقابل میں کون ہے۔ کوئی دوست کوئی رشتہ دار کوئی

[1] یہ در اصل مصنف کتاب کے اپنے الفاظ ہیں لیکن یہ اس مکالمہ کا مفہوم ادا کرتے ہیں۔ جو اس موقع پر شری کرشن جی اور ارجن میں ہُوا +

ہمجولی۔ ان کو اپنے ہاتھوں دُنیا سے رُخصت کرکے زیست کا کیا مزا۔ اور اس جہاد کی اصلی غرض کیا ہے +

شری بھگوان نے اپنی زبان معرفت ترجمان سے جہاں خدا کی راہ میں تلوار چلانے اور جہاد کرنے کی حقیقت اور اُسکے جواز کی فلسفی بیان کی وہاں ساتھ ہی مذکورہ بالا الفاظ کے جواب میں یہ بھی کہا۔ کہ اگر انسان کا موت کے ساتھ ہی خاتمہ ہو جاتا اور رُوح غیر فانی نہ ہوتی تو پھر بیشک مقام تاّمل تھا لیکن اگر موجُودہ زندگی ایک چولے کی طرح ہے۔ کہ جس کے اُتر جانے پر ایک اَور چولہ انسان کے لئے طیّار ہو جاتا ہے تو پھر کیا خوف۔ کورو کی زندگی کا چولا اس وقت اس قدر ناپاک اور کثیف ہو چکا ہے۔ کہ اس چولہ کا نابُود کر دینا ہی اس دنیا کے لئے مفید ہے۔ یہ چولا اپنی کثافت اور آلُودگی کے باعث اب زیادہ استعمال کے قابل نہیں رہا۔ اب تو اس چولے کا پھاڑا جانا ہی بہتر ہے +

کرشن جی مہاراج نے ایک عجیب فلسفہ تو جہاد کا بیان کیا اور

اس میں بھی شک نہیں کہ نبی عربؐ کے سامنے جو عرب کے کورو تھے اُن کا جامہ تو ہستناپور کے باشندوں سے کہیں زیادہ چرک اور گندہ ہو چکا تھا۔ لیکن بات یہ تھی کہ میرے آقاؐ اس کثیف اور چرک چولے کو کثافت سے پاک کر سکتے تھے۔ وہ چولے کو نابود کرنے کے بجائے اُسے سفید بُراق بنا کر استعمال کے قابل بھی کر سکتے تھے۔ چنانچہ جب آپؐ نے ذرا سی توجّہ کے ساتھ اُس چولے کو معدوم کرنے کی بجائے اُس کے قائم رکھنے کا ارادہ ظاہر فرمایا تو آناً فاناً اُس چولے میں صفائی کے آثار ظاہر ہونے لگے +

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے اِس خُلقِ عفو کے اِظہار کو دیکھ کر کُفّارِ عرب آپ کی تعلیم پر عش عش کر اُٹھے۔ اور بیک زبان پُکارے

لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

مقام غور ہے۔ کہ فاتحؐ مکّہ نے نہ صرف اپنا ہی انتقام لینا تھا بلکہ اپنے ساتھیوں کا بھی اُسے انتقام لینا تھا۔ لیکن اُن

ساتھیوں کی اطاعت اور ان کا ایمان و انقیاد بھی کس قدر زبردست ہے۔ کہ وہ سب کے سب اپنے آقاؐ کے فیصلہ کو بسر و چشم قبول کر کے اپنے دلوں کو غباروں سے پاک کر دیتے ہیں۔ اور آنِ واحد میں دشمن بھائی ہو جاتے ہیں +

دراصل ان سب نے سب کھویا ہوا پا لیا۔ بلالؓ اپنے سالہائے دراز کی تکلیفیں بھول گیا جب اس نے بُتکدۂ کعبہ پر جا کر بلند آواز سے

اشہد ان لا الٰہ الا اللہ و اشہد ان محمد رسول اللہ

اذان میں کہا۔ صدیقؓ نے۔ فاروقؓ نے۔ ذوالنورینؓ اور فاتحِ خیبرؓ نے اور اُن کے ساتھ کُل کے کل مہاجرین نے سب کچھ ہی پا لیا جب اپنے ہاتھ سے اپنے جد امجد علیہ السلام کے ہاتھ سے بنائے ہوئے گھر کو بُتوں سے پاک کر کے مکّہ کو بُتوں کی حکومت سے آزاد کیا۔ اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی یہ دُعا پوری ہوئی :-

ل حضرت بلال علیہ السلام شین پکار نہ سکتے تھے + منہ

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ ۝ رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ ۚ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ - پ ۱۳

ترجمہ - اے مولا - اس شہر مکّہ کو غیر قوم کی حکومت سے امن میں رکھیو - اور مجھے اور میری اولاد کو بُتوں کی پرستش سے بچائیو - ان بتوں نے ایک زمانہ کو گمراہ کر رکھا ہے - میری اولاد میں سے جو میرے قدم پر چلا وہی مُجھ سے ہے - اور جو میری راہ سے الگ ہو کر بُت پرست ہو گا تُو تو پھر غفور اور رحیم ہے ان سے غُفران اور رحم کے ساتھ مُعاملہ کیجیو +

کیا پاکیزہ اور اعلےٰ جذبات کو اندر لئے ہوئے یہ دُعا ہے - عربی زبان میں امن کے معنے غیر کی حکُومت سے محفُوظ و مامُون رہنے کے ہیں - جناب ابراہیمؑ اس وقت دو اِلتجائیں جناب باری سے رکھتے ہیں - وہ چاہتے ہیں کہ ان کی اولاد ہر طرح خدا کی حکُومت تلے ہی رہے - اور اِنسانی حکومت سے آزاد رہے - جسمانی طور سے ہمارے حکُمران ہمارے فرمانروا ہُوا

کرتے ہیں۔ اور رُوحانی طور پر ہمارے حاکم ہمارے معبُود جناب باری میں عرض ہوتی ہے۔ کہ مکّہ اور اُس کے مکان کو جِسمانی طور سے بھی اپنی حکُومت میں رکھیو یعنے اُن کا حاکم کوئی غیر قوم کا نہ ہو۔ نہ کوئی اُن کا بادشاہ ہو۔ اور رُوحانی طور پر بجُز تیرے اُن کا کوئی معبُود نہ ہو۔ خدا کے سوا جو کوئی کسی کا معبُود ہے بُت ہی بُت اور صنم ہی صنم ہے۔ جسمانی طور پر تو دُعا کچھ اِتنی جلد قبول ہوئی۔ کہ اس مُستجابُ الدّعوات انسانؑ کے بعد آج تک کسی غیر قوم نے اُس جگہ حکُومت نہ کی۔ نہ کسی کو اُس کے فتح کرنے کا حوصلہ ہُوا۔ اور آج جس سلطنت کے متعلّق یہ علاقہ سمجھا جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خادمِ حرمین شریفین لکھنا اپنا فخر سمجھتی ہے۔ ہاں رُوحانی طور سے دُعا کے الفاظ ہی کہتے ہیں۔ کہ بُتوں کی عالمگیر حکُومت دیکھ کر جناب ابراہیمؑ کو ان سے ضرور کچھ کھٹکا تھا۔ اِس لئے ان سے بچنے کی دُعا تو آپ نے مانگی ہے لیکن خطرہ بھی ساتھ ہی ہے کہ اولادیں بُت پرستی پیدا نہ ہو جائے ✤

سُبحان اللہ یہ انبیاءؑ کا گروہ بھی کیسا دل کا رحیم ہُوا کرتا ہے
اور خدا کی جناب میں کس ادب کے ساتھ اظہار مطلب کیا
کرتا ہے۔ آپؑ نے عرض کی کہ مولا میری اولاد تو دراصل وہی ہے جو
میرے طریق پر چلے اور بُتوں سے الگ رہے۔ ہاں جو اُن
میں بُت پرست ہو جائیں۔ تو اس اواب اور حلیم نے
اُن کے لئے بددُعا نہیں کی۔ بلکہ عرض کی کہ میرا تو ان سے تعلّق
نہیں۔ نہ وہ مُجھ سے ہیں۔ لیکن تُو تو غفور الرحیم ہے۔ ان کے
ساتھ اپنے ہی رحم اور غفران سے کام لینا۔

مکّہ جو رُوحانی طور پر خدا کی حکومت سے نکل کر حکومتِ اصنام
میں آ چُکا تھا۔ اس کے متعلّق دُعائے ابراہیمؑ کے پورا ہونے کا
وقت آ چُکا۔ بُتوں کی حکومت کا خاتمہ ہونے والا ہے۔ ابراہیمؑ
کی اولاد کے اس وقت دو گروہ ہیں۔ ایک وہ جنہوں نے
بمصداق فمن تبعنی آپ کی اتّباع میں بُتوں سے اجتناب
کیا ہُوا ہے۔ اور دوسرا وہ جنہوں نے اپنے جدّ امجد کا راستہ
چھوڑا ہُوا ہے۔ لیکن دُعا تو اُن کی بھی سلامتی چاہتی ہے۔ وہ

تو ان کے لئے رحم اور معافی کی خواستگار ہے۔ اب اگر آنحضرة صلعم فتح مکّہ کے بعد اُن بُت پرستوں کو سزا دیتے۔ تو یہ الفاظ ابراہیم کی دُعا کے کس طرح پورے ہوتے۔ اس لئے ابراہیمؑ کے حقیقی نام لیوا نے جو فے الواقعہ عبدُا الغفور اور عبدالرحیم تھا۔ اپنے عفو سے ثابت کر دیا۔ کہ اُس کی جد امجد کی دعا فانك غفورٌ رحیم خدا کی جناب میں ضائع نہیں گئی۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَعَلٰے اٰلِ سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّبَارِكْ وَسَلِّمْ

در دلم جوشد ثنائے سرورے
آنکہ در خُوبی ندارد ہمسرے

آنکہ جانش عاشقِ یارِ ازل
آنکہ رُوحش واصلِ آں دلبرے

آنکہ مجذُوبِ عنایاتِ حق است
ہمچو طفلے پروریدہ در برے

آں رحیم و رحمِ حق را آیتے
آں کریم وجودِ حق را مظہرے

آں رخِ فرخ کہ یک دیدارِ او
زشت رُو را میکند خوش منظرے

آں دلے روشن کہ روشن کردہ است
صد درونِ تیرہ را چوں اخترے

احمدِؐ آخر زماں کز نورِ او
رحمتے زاں ذاتِ عالم پرورے

برلبش جاری ز حکمت چشمۂ — در دلش پُر از معارف کوثرے
آں چراغش داد حق کش تا ابد — نے خطر نے غم ز بادِ صرصرے
کرد ثابت بر جہاں عجزِ بُتاں — وانمودہ زورِ آں یک قادرے
خواجہ و مر عاجزاں را بندۂ — بادشاہ و بیکساں را چاکرے
روشنی از وے بہر قومے رسید — نور او زخشید بر ہر کشورے
منکہ از حُسنش ہمے دارم خبر — جاں فشانم گر دہد دل دیگرے
یادِ آں صورت مرا از خُود بُرد — ہر زماں مستم کند از ساغرے
مے پریدم سوئے کوئے او مدام — من اگر مے داشتم بال و پرے
خوبئ او دامنِ دل مے کشد — مو کشانم مے برد زور آورے
دیدہ ام کو ہست نُورِ دیدہ ہا — در اثر مہرش چو مہرِ انورے
ہر کہ بے او زد قدم در بحرِ دیں — کرد در اوّل قدم گم معبرے
آں شرابِ معرفت دادش خدا — کز شعاعش خیرہ شد ہر اخترے
شد عیاں از وے علی الوجہ الاتم — جوہرِ انساں کہ بود آں مضمرے

ختم شد بر نفسِ پاکش ہر کمال
لاجرم شد ختم ہر پیغمبرے

۲۳ اپریل سنہ ۱۹۱۱ء

مصنفہ مرزا جلال الدین احمد

عرضِ حال بہ محبوبِ ذوالجلال

الموسوم بہ

فغانِ درد

زکوچۂ تو بقتلم بلند غوغا ایست	شدند غیر کہ یارم بُدند۔ غوغا ایست
رسن بہ گردن و پایم کُنند غوغا ایست	زبند بند تمامی بُرند۔ غوغا ایست
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
جلالِ عشقِ تو خورشیدِ محشر آرا ایست	جمالِ پرتوِ حُسنِ تو ماہِ سیما ایست
دلم کتان و روانم حباب آسا ایست	بہ پیش شکستِ طلسمم کہ راحت افزا ایست
بجرمِ عشقِ تو ام مے کشند غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
بزن بکوب دے بہ بندِ بکش صدا ہا ایست	قیامت از قدِ ناز آفرینتِ پیدا ایست
کسے زید کہ بمیرد ترا چہ پروا ایست	بمقتضائے محبّت ولے تمنّا ایست
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند و غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
مرا نہ غیر ازیں ہیچ فکر و پروا ایست	چو مقتلم پسِ دیوارِ آسماں سا ایست
بس ایں قدر بدمِ آخرم تمنّا ایست	اگر حصُول شود عینِ لُطفِ والا ایست
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند و غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
عجب عدالت و انصافِ اہلِ دنیا ایست	کہ بہرِ قتلِ منِ دلفگار فتوٰے ایست
برائے طالبِ نظارہ یومِ فردا ایست	بزیرِ سایۂ دیوارِ تو عجب جا ایست
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند و غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
شہا سُنا تھا ترا گیت جو کہ گاتا ہے	جگہ وہ اہلِ زمانہ کے دِل میں پاتا ہے
سر آنکھ پر اُسے اپنی ہر اک بٹھاتا ہے	مگر یہاں تو نظر اَور ہی کچھ آتا ہے
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند و غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست
جہاں کہیں کبھی صحرائے خشک پاتا ہوں	ترے ہی داغِ محبّت کے گل کھِلاتا ہوں
ترا ہی نغمہ ترا ہی ترانہ گاتا ہوں	پھر اس پہ موردِ الزام بنتا جاتا ہوں
بجرمِ عشقِ تو ام میکشند و غوغا ایست	تو نیز بر سرِ بام آکہ خوش تماشا ایست

جہاں کہیں بھی کہ باغِ جہاں میں جاتا ہوں
نہال غنچہ وگُل - باغ باغ پاتا ہوں
تری بہار کے نغموں سے چہچہ
غضب ہے ، پھر بھی نہیں بُلبُلوں کو بتا ہو

بجرم عشق توام میکشند غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

سُنا تھا عشق تمہارا محبّت افزا ہے
نہ باہم اُن میں رقابت نہ رنج وکینا ہے
بہم دِگر تیرا والا اِک اِک یہ شیدا ہے
مگر شہا یہ میرے ساتھ ہو رہا کیا ہے

بجرم عشق توام میکشند غوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

مَیں کیا کروں کہ مَیں جس شاہ کا غلام ہُوا
جُوں ہی قدم ترے ایوانِ عشق میں رکھا
وہی وہی ترے کُوچے کا خضرِ راہ بنا
ہمارے قتل کا یاروں نے دیا فتوےٰ

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سرِ بام کہ خوش تماشا ایست

وہ نقشہ دار و رسن کا جو مَیں نے دیکھا تھا
کہ مجھ کو یاد مع الصابرین کا ہے مژدا
اگر یہی ہے تو حاضر ہے یہ پھر گلا میرا
ترے غلام کا مَیں تو غلام ہُوں مولا

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

مگر کسی کا بھی اس میں نہیں قصور اصلا
کمالِ عشق کہاں ، نقص ہیں ابھی صدہا
یہ میری خامی کی اصلاح کا ہے اِک نُسخہ
دگرنہ یار کہاں ! اور کہاں یہ استدعا

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

چو سرِّ عشق ز دل بر لبم نمے آمد
گہے برقص و تواجد دلم نمے آمد
دُرِ مُراد گہے در کفم نمے آمد
زمانِ نغمہ کہ سر میکنم نمے آمد

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

الاالحی ! کہ نہ بر یاریم کمر بندی
فغاں کنم - نہ بغمخواریم کمر بندی
عجب عجب ! بہ نگوساریم کمر بندی
شہا ! بہ بیں بدل آزاریم کمر بندی

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست [illegible]

علاج دردِ دل نفتہ جاں ! چہ بے خبری
ز لوحِ مشقِ جفائے جہاں - چہ بے خبری
ز رنجِ خاطرِ آشفتہ جاں چہ بے خبری
ببیں ز حالِ من ناتواں چہ بے خبری

بجرم عشق توام میکشند دغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

بپاس دردِ محبّت نشاں برائے خدا
کسے بگویدش اے ہمرہاں ! برائے خدا
پیامِ شوقِ منِ خستہ جاں برائے خدا
کہ اے ظہورِ کمالِ جہاں برائے خدا

بجرم عشق توام میکشند وغوغا ایست
تو نیز بر سر بام آ کہ خوش تماشا ایست

تمت